زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے
پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے
دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

ہندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف =/1,000 میں دستیاب ہے

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ---- Phone: (009242) 7280916 5863609

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۲ ماہ شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۸ء عدد ۲

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

قبلہ اول ایک عظیم سازش کی زد میں ہے۔ اس کی جگہ پر یہودی معبد کی تعمیر کی تیاریاں شب و روز جاری ہیں۔ یہ بات عام طور سے معلوم ہے کہ بیت المقدس کی جائے وقوع وہی ہے جہاں کبھی ہیکل سلیمانی کی عمارت تھی، جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے بطور عبادت گاہ تعمیر کیا تھا۔ یہودی اسے سالومنس ٹمپل یا فرسٹ ٹمپل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل کے حکمراں بخت نصر کے ہاتھوں اس کی بربادی کے بعد ۵۱۶ قبل مسیح میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اسے سیکنڈ ٹمپل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہیراڈ اعظم (۷۳ ق م - ۴ء) نے اس میں اضافہ اور توسیع کی۔ چنانچہ اسے سیکنڈ ٹمپل کے ساتھ ساتھ ہیراڈس ٹمپل کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ۷۰ء میں رومیوں کے ہاتھوں اس کی بربادی کے بعد اسے پھر تعمیر نہیں کیا جاسکا۔ اس وجہ سے دو ہزار سال سے یہودیوں کی بہت سی مذہبی رسوم بالخصوص قربانی سے تعلق رکھنے والی عبادات (Korbanot) موقوف ہیں۔ یہودی قوانین کی رو سے اس معبد کی تعمیر نو کے بغیر تورات کے بہت سے احکام پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے یہودی اس معبد کی تعمیر کے لیے جسے وہ تھرڈ ٹمپل کہتے ہیں، برابر کوشاں رہے ہیں۔ یہ ایک خواب ہے جس کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ چونکہ یہ معبد اس وقت تک تعمیر نہیں ہوسکتا جب تک قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ اپنی جگہ موجود ہیں، اس لیے ان مقدسات کو وہاں سے ہٹانے اور ان کی جگہ نئے معبد کی تعمیر کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہودی ایک وسیع الاطراف منصوبہ پر کام کررہے ہیں۔ اس منصوبہ کے ایک حصہ کے طور پر مسلمانوں کے درمیان قبۃ الصخرہ کی تصاویر اتنے بڑے پیمانے پر پھیلادی گئیں کہ عام طور سے اسی کو مسجد اقصیٰ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ کم ہی لوگ تصویر سے مسجد اقصیٰ کو شناخت کرسکتے ہیں۔ ہمارے لیے قبۃ الصخرہ بھی بہت اہم ہے اور وہ بھی ان کے ناپاک عزائم کی زد میں ہے لیکن ان کی ترجیحات میں مسجد اقصیٰ پہلے آتی ہے۔ چنانچہ مسجد اقصیٰ کے نیچے اثریاتی تحقیق کے نام پر کھدائی کا کام مسلسل جاری ہے۔ اس کا بنیادی مقصد قبلہ اول کی بنیادوں کو نقصان پہونچانا ہے۔

تھرڈ ٹمپل کی تعمیر کے لیے تیاریوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یروشلم میں ٹمپل انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ برسوں سے سرگرم عمل ہے۔ اس کے مقاصد میں بائبل میں ہیکل سلیمانی سے متعلق عبادات و رسوم کے بارے میں دستیاب مواد کی تحقیق کے ذریعہ ان اشیاء کا تعین جن کے بغیر یہ رسوم انجام نہیں دی جاسکتیں اور ان کی تیاری کے لیے ضروری اقدامات کرنا شامل ہے، ان اشیاء کی فہرست خاصی طویل ہے۔ یہ اشیاء اسی انداز، اسی رنگ اور اسی خام مواد سے تیار کی جاتی ہیں، جو دو ہزار سال پہلے اس معبد میں زیر استعمال تھیں۔ ان میں مجوزہ معبد کا تفصیلی خاکہ بھی شامل ہے۔ اس طویل فہرست میں سے متعدد اشیاء کی تیاری پایہ تکمیل کو پہونچ چکی ہے۔ ماہ جولائی کی ۲ تاریخ کو اس سلسلہ میں ایک اور مرحلہ پورا ہونے سے

متعلق ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ یہ معبد کے ربیوں کے روایتی لباس سے متعلق ہے۔ یہ منصب حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ اس لباس کو صرف وہی پہن سکتے اور وہ بھی صرف اس صورت میں جب مجوزہ معبد کی تعمیر مکمل ہوجائے۔ خبر کا خلاصہ یہ ہے کہ برسوں کی تحقیق اور دیدہ ریزی کے بعد اس لباس سے متعلق مختلف امور کا تعین کرلیا گیا ہے، اس موقع پر بعض ربیوں کے جسم کا ناپ بھی لیا گیا۔ قبلہ اول اور اسلام کی تیسری مقدس ترین مسجد کے خلاف منصوبے اب کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ مسلمانان عالم کے لیے اس کے مضمرات کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

یہودیوں کے دوسرے منصوبوں کی طرح اس منصوبہ میں بھی ان کو عیسائیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ عیسائی دو ہزار سال تک یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قاتل قرار دیتے رہے۔ اسی وجہ سے عیسائی معاشروں میں ان کے ساتھ شدید نفرت اور عداوت کا معاملہ کیا جاتا رہا ہے۔ عیسائیوں نے یہودیوں پر جو مظالم کیے ہیں، ان سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں لیکن عیسائیت میں پروٹسٹنٹ تحریک کی ابتداء ہی سے یہودیوں کے سلسلہ میں عیسائیوں کے طرز فکر میں تبدیلی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ فری مسن اور پھر صیہونیت کے زیر اثر مغربی ممالک بالخصوص انگلینڈ کے حکمراں طبقہ کے اندازِ فکر میں یہودیت کے لیے ہمدردانہ رویہ کی ابتداء ہوچکی تھی جو بالآخر مملکت اسرائیل کی تاسیس کے سلسلہ میں برطانیہ کی مکمل تائید و حمایت پر منتج ہوا۔ یہودی عیسائی تعلقات کی تاریخ میں پوپ پال ششم کے عہد (۱۹۶۳-۱۹۷۸ء) کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ۲۸ فروری ۱۹۶۷ء کو ایک فرمان کے تحت قتل مسیح کے الزام سے یہودیوں کی براءت کا اعلان کردیا۔ ان کے جانشین پوپ جان پال دوم کے عہد (۱۹۷۸-۲۰۰۵ء) میں اسرائیل اور ویٹی کن کے درمیان ۱۹۹۴ء میں سفارتی تعلقات استوار ہوئے۔ موصوف نے یہودیوں کے خلاف عیسائیوں کے ذریعہ کی جانے والی زیادتیوں اور مظالم کا باضابطہ اعتراف کیا۔ دیوار گریہ پر دعا کی اور یہودیوں کی اتباع میں دیوار کے شگاف میں جو رقعہ چھوڑا اس میں بھی یہ اعتراف شامل تھا۔ انہوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ یہودی خدا کی محبوب قوم (Chosen people of God) ہے اور عیسائیوں کے لیے ان کی حیثیت بڑے بھائی کی ہے۔ موجودہ پوپ اس پالیسی کو نہ صرف جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ آگے بڑھا رہے ہیں۔

عیسائیوں میں بنیاد پرست پروٹسٹنٹ تحریک (Protestant fundamentalism) کا معاملہ اس سے بھی بہت آگے ہے۔ اس عقیدہ کے ماننے والوں کے درمیان آج کل ایک رجحان بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے اور ایک اندازہ کے مطابق اس وقت امریکہ میں ۱۰۰ سے ۱۲۵ ملین تک لوگ اس کے زیر اثر ہیں۔ یہ وسیع حلقہ امریکہ کی داخلی پالیسی کی تشکیل ہی میں نہیں بلکہ اس ملک کی عالمی پالیسی کی صورت گری میں بھی نہایت فعال کردار ادا کرتا ہے۔ یہودیت نوازی اور اسلام دشمنی اس کے عناصر ترکیبی کے دو اہم اجزاء ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے

کہ ارض فلسطین میں یہودیوں کی واپسی اور وہاں ان کا ارتکاز بائبل کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق اور ان کی تعبیر ہے۔ اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں مسیح علیہ السلام کی دوبارہ واپسی اسی وقت ہوگی جب فلسطین پر یہودیوں کا مکمل غلبہ ہوجائے گا اور حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد کے لیے حالات کو سازگار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے دوسری قوموں یعنی فلسطینیوں سے یکسر پاک کردیا جائے۔ اسی لیے یہ لوگ فلسطین میں مکمل یہودی تسلط اور فلسطینیوں کے خلاف حکومت اسرائیل کی پالیسیوں کی غیر مشروط حمایت کرتے ہیں اور ہر ممکن طریقہ سے ان کی مدد اپنے فرائض میں محسوب کرتے ہیں۔ اسی نسبت سے ان کو صہیونی عیسائی (Christian Zionists) اور اس تحریک کو صہیونی عیسائیت (Christian Zionists) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بیت المقدس اور فلسطینیوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں کی منصوبہ بندی اور ان کی تکمیل کی کوششوں میں یہودیت کو عیسائیت کا بھرپور تعاون حاصل ہے اور عیسائیوں کی ایک قابل ذکر تعداد اس کو ایک مذہبی فریضہ تصور کرتی ہے۔

اس تناظر میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ بہت پرخطر ہے۔ بظاہر مسلم ممالک کے حکمرانوں اور زعما کو حالات کی سنگینی کا صحیح ادراک نہیں ہے۔ چنانچہ اس امڈتے اور بپھرتے ہوئے طوفان کے سدباب کے لیے کوئی موثر منصوبہ موجود نہیں ہے۔ لیکن خالق کائنات اپنے منصوبوں کی انجام دہی کے لیے ان بودے حکمرانوں کا محتاج نہیں ہے۔ رات کی تاریکی جب سارے عالم پر محیط ہوتی ہے تو ایک روشن صبح کا تصور مشکل ہوتا ہے لیکن تاریکی چاہے کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو بالآخر چھٹ جاتی ہے اور اپنی تمام تر ضوفشانیوں کے ساتھ صبح طلوع ہوکر رہتی ہے۔ اس تیرہ و تاریک ماحول میں بھی حماس اور حزب اللہ کی بے مثال قربانیاں اور اسرائیلی تسلط کے خلاف ان کی پرعزم، دلیرانہ اور ایمان و یقین سے بھرپور جدوجہد شمع فروزاں کی حیثیت رکھتی ہیں اور اتنے ناسازگار ماحول میں ان کی کامیابیوں میں دست قضا کی کارفرمائی صاف نظر آرہی ہے۔ اسرائیل کی ناقابل تسخیر تصور کی جانے والی فوج کی حزب اللہ کے مقابلہ میں شرمناک پسپائی اور اب قیدیوں کی رہائی کا معاہدہ نیز حماس سے اسرائیل کی جنگ بندی کے معاہدہ سے مستقبل میں ابھرنے والی صورت حال کا کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اسرائیل اپنی تمام تر ترقیوں اور کامیابیوں کے باوجود مغرب بالخصوص امریکہ کی فراہم کردہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہے جو قرآنی فرمان حبل من الناس کی نہایت واضح تفسیر ہے، جو لوگ اسرائیل کی اندرونی صورت حال سے واقف ہیں اور جن کی دنیا کی ہر آن بدلتی ہوئی صورت حال پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ بیساکھی ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کا الٰہی قانون امریکہ پر بھی نافذ ہوکر رہے گا اور اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوچکے ہیں، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے۔ قرائن بتارہے ہیں کہ سرزمین مقدس فلسطین میں صلیبیوں کی تاریخ دہرائی جانے والی ہے۔

مقالات

رسالت محمدی ﷺ اور مغرب کا معاندانہ رویہ

(ایک جائزہ)

جناب غلام حسین بابر

اسلام اور مغرب کی کشمکش کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ رسالت محمدیؐ سے متعلق مغرب کا رویہ ہمیشہ سے معاندانہ رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ رسالت و نبوت کی قدرومنزلت ہے جو قرآن مجید میں اصول، عقیدے اور صلاح و فلاح کے طور پر پیش کی گئی ہے، قرآن مجید میں رسالت و نبوت کی حقیقت اور مقصدیت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ خدائی احکام و ہدایت کی توضیح و تشریح ایک نبی کے سپرد کی جاتی ہے، اس کے ساتھ نبی کی ذات کو لوگوں کے لیے نمونہ تقلید قرار دیا جاتا ہے، مزید یہ کہ نبی کے پاس تشریعی اختیارات بھی ہوتے ہیں اور اسے قاضی اور منصف کا منصب بھی تفویض کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ رسالت و نبوت، اسلامی نظام کی تشکیل میں بنیادی حیثیت بھی رکھتی ہے، یہ تمام حقائق قرآن میں ذکر کیے گئے ہیں۔

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱)

(اور ان پیغمبروں کو) اور کتابیں دے کر (بھیجا تھا) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے، تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں، وہ ان پر ظاہر کردو اور تاکہ وہ غور کریں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲)

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف

لیکچرر ایرانی زرعی یونی ورسٹی، راول پنڈی۔

کردے گا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (۳)

تم کو پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۴)

وہ انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان پر تھے اتارتے ہیں تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی، وہی مراد پانے والے ہیں۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵)

سو جو تم کو پیغمبر دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور خدا سے ڈرتے رہو بے شک خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (۶)

(اے پیغمبر) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے، تاکہ خدا کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرو اور (دیکھو) دغابازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (۷)

اور (اے نبی) کہہ دو کہ جو کتاب خدا نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تم میں انصاف کروں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۸)

مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب خدا اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان میں فیصلہ کریں تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا، بے شک یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۹)

تمہارے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (۱۰)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کردیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گم راہ ہوگیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۱۱)

مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

ان تمام مندرجہ بالا آیات ربانی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ منصب رسالت و نبوت کی قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ کیا ہے اور بعثت محمدیؐ کا مقصد کیا ہے، آیات مذکورہ میں یہ حقیقت بیان ہوتی ہے کہ رسالت محمدیؐ کی غرض و غایت میں تین چیزیں سرفہرست ہیں:

۱- آپ لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم دیں۔ ۲- کتاب اللہ کی بنیاد پر حکمت کی تعلیم دیں۔
۳- انفرادی اور اجتماعی تربیت کا بندوبست کریں۔

ان تین مقاصد کا لازمی نتیجہ اسلامی نظام کی صورت میں عملاً سامنے آتا ہے جس میں رسالت محمدیؐ کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس بنیادی حیثیت کی وجہ یہ ہے کہ رسالت ہی دراصل وہ ذریعہ ہے جس سے خدا کے احکام و تعلیمات سے آشنائی ہوتی ہے، اسی لیے خدا کی اطاعت و پیروی کے ساتھ نبی کریمؐ کی اطاعت کو لازمی شرط کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۱۲)
کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، تاکہ اللہ تم سے محبت کرے۔

رسالت و نبوت کی اس حقیقت و اہمیت کے بعد مغرب کے معاندانہ رویے پر غور کیا جائے تو معاملہ سمجھ میں آتا ہے کہ مغرب اور اسلام میں فیصلہ کن اور حتمی مسئلہ رسالت محمدیؐ کا ہے، چوں کہ اسلام کی اصل بنیاد رسالت محمدیؐ سے وابستہ ہے، اسلام کا سرچشمہ علم، اہل ایمان کا تزکیہ، انفرادی اور اجتماعی صلاح و فلاح اور اسلام کا بہ طور تہذیب و نظام کا ہونا سب رسالت محمدیؐ سے وابستہ ہیں، اسی لیے جب اہل مغرب اسلام کو بہ حیثیت مذہب، بہ حیثیت نظام یا بہ حیثیت تہذیب دیکھتے ہیں تو اس تمام منظر نامے میں "رسالت محمدیؐ" روح کی حیثیت سے ان کے سامنے آتی ہے، مزید برآں جب اہل مغرب مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت، محبت و اخوت، جذبۂ ایثار و قربانی، شوق شہادت، جذبات و احساسات کی مرکزیت پر غور کرتے ہیں تو یہاں پر بھی ان کو رسالت محمدیؐ کی اولیت دکھائی دیتی ہے، دراصل یہی حقائق ہیں جن کی بنیاد پر اہل مغرب نے ہمیشہ اسلام اور پیغمبر اسلام پر بے بنیاد سوالات اٹھائے ہیں اور اپنے اس معاندانہ رویے کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دی ہے جس کو تحریک استشراق (Orientalism Movement) کہا جاتا ہے۔ (۱۳)

تحریک استشراق کی ایک تاریخ ہے جو دراصل اسلام اور بالخصوص پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کے واقعات کو مسخ کرنے سے عبارت ہے، تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل مغرب نے پیغمبر اسلامؐ کے خلاف اپنے بغض و عناد کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا ہے، اس بغض و عناد کی تاریخ میں اہل مغرب نے ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیا اور انتہائی مبہم اور ناقص معلومات کو بنیاد بنا کر تلبیس و تدلیس پر

مبنی طرز عمل کا مظاہرہ کیا جو ان کی فتنہ پردازی، بدنیتی اور بغض و عناد کا عکاس ہے۔

رسالت محمدیؐ سے متعلق اس مغربی معاندانہ رویے کی تاریخ قدیم ہے اور اس تاریخ کا بنیادی محرک سینٹ جان آف دمشق ہے (۱۴)، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعوایہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا جس نے حضورؐ کی ذات اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کردی، اسی نے حضورؐ کو نبی کی حیثیت دینے کی بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی اور گم راہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی۔ (۱۵)

جان کے بعد آنے والے قرون وسطی کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویر رسولؐ کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات و اتہامات عاید کیے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم و بیش یکساں تھے، اسی لیے جب بھی انہوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسلؐ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پر پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بہ دستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار اور شیطان کا چیلا قرار دیتے رہے (نعوذ باللہ)۔ (۱۶)

واضح رہے کہ قرون وسطی کا زمانہ یورپ کی تاریخ کا تاریک ترین زمانہ ہے جو زوال روم سے شروع ہوتا ہے اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں پاپائیت کا راج تھا، پوپ بجز مذہبی ادب کے تمام اصناف علم کا دشمن تھا اور جہاں کہیں کوئی عالم یا فلسفی یا مفکر سر اٹھاتا تا، اسے کچل دیتا۔

پیغمبر اسلامؐ سے متعلق اہل مغرب کے معاندانہ رویے کی تاریخ کا دوسرا اہم دور اس زمانے سے ہے جب صلیبی جنگوں نے پورے مغرب میں اسلام دشمنی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا، اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو اپنی علمی تحقیق کا نہیں بلکہ اپنی الزام تراشیوں کا ہدف بنایا اور تاریخی حقائق کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے تخیل کی بلند پروازی

کے ذریعے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

اسلام کے خلاف کارروائیوں میں ان کا بنیادی ہدف حضورؐ کی ذات بابرکات رہی، اس دور میں انہوں نے فرضی تصویری کہانیوں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ذریعے حضورؐ کی ذات بابرکات، آپؐ کی تعلیمات اور آپؐ کے پیروکاروں کی کردار کشی کی۔(۱۷)

صلیبی جنگوں کے طویل سلسلہ سے اہل مغرب پر یہ باور ہوگیا کہ میدان جنگ میں مسلمانوں سے معرکہ آرائی کبھی جیتی نہیں جاسکتی تو پھر انہوں نے کمال عیاری سے اپنی تدابیر اور حکمت عملی میں کئی تبدیلیاں کیں، ان تمام تبدیلیوں کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ اب مسلمانوں سے جنگ علم وتحقیق کے ذریعے سے لڑی جائے، علم وتحقیق کے لیے درکار تمام وسائل ان کے پاس اس صورت میں موجود تھے کہ مغرب کے پاس اسلام مخالف ایک بہت بڑا طبقہ موجود تھا اور دوسری طرف پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں مہمل خیالات، قصے، کہانیاں، بے بنیاد الزامات اور شکوک وشبہات کا ایک ایسا صحرا آباد تھا جس میں حقیقت نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی، البتہ تعصب اور بدنیتی کے کئی عوامل موجود تھے، مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں اب عیسائی، یہودی راہبوں اور پادریوں کے ساتھ مغربی علما اور محققین بھی شامل ہوگئے، تاکہ تحقیق کی بنیاد پر اپنے تعصبات پر مبنی عزائم کی تکمیل کی جائے اور ساتھ ساتھ دنیا پر علم وتحقیق کا رعب ودبدبہ بھی قائم کیا جائے، سولہویں صدی عیسوی میں یہ تمام کوششیں باقاعدہ ایک منظم صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغرب کی یہ علمی تحریک (استشراق) باقاعدہ ارتقائی مراحل میں داخل ہوتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے سنین وسطیٰ، یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہیں، یورپ کی جدوجہد، سعی وکوشش اور حریت وآزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادرالوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی وسیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہوئے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا، اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام وسیرت پیغمبرؐ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی،

گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔(۱۸)

اخیر اٹھارہویں صدی کے بارے میں علامہ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے ''اورینٹلسٹ'' کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنہ شرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کیے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا(۱۹)، علامہ شبلیؒ نے اس تاریخی پس منظر میں مغربی مفکرین کی کوششوں کا تذکرہ کیا ہے جو سیرت نبوی سے متعلق ہے، علامہ نے سینتیس مستشرقین کی کتب کو نقل کیا اور یورپی مصنفین کو تین مختلف درجوں میں تقسیم بھی کیا ہے:

۱- جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

۲- عربی زبان اور علم وادب وتاریخ وفلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، یہ لوگ سیرت یا شارع اسلامؐ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔

۳- وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولیوس صاحب ان سے ہم بہرحال کچھ امید کرسکتے تھے باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں (۲۰)

یہ وہ حقائق ہیں جو اہل مغرب کے اس علمی طبقہ سے متعلق ہیں جو اپنی تمام تر کوششوں کا مرکز اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو بنائے ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی میں جب نوآبادیاتی نظام کے شکنجے کی گرفت کم زور پڑنے لگی اور مسلمان علاقوں میں آزادی کی تحریکوں نے پروان چڑھنا شروع کیا اور مغربی استعمار کے خلاف عملی جدوجہد کا آغاز ہوا تو کچھ مغربی مصنفین نے اپنے طبقے کے مفکرین پر تنقید کی اور اپنے آپ کو غیر جانب دار بنا

کر کچھ کتابیں لکھیں لیکن اس قسم کے یورپی مصنفین نے بھی اکثر مقامات پر تعصب اور جانب داری کا مظاہرہ کیا، مسلمان ممالک کی آزادی کے بعد یہ مستشرقین استعماری طاقتوں کے حکمراں طبقہ کے دست راست کے طور پر کام کر رہے ہیں، نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد مغربی مفکرین نے مسلمانوں کے خلاف ایک طویل اور منظم منصوبہ بندی کی ہے، اس طویل اور منظم منصوبہ بندی کے کئی پہلو ہیں، مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بدحال کر کے مخصوص طرح کا نظام تعلیم مسلمان ممالک میں رائج کیا گیا ہے، جس نظام تعلیم میں پڑھنے والا شخص دراصل مغرب کے حقوق کی حفاظت کرنے والا بن کر ابھرتا ہے، اس نظام تعلیم میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اقدار و روایات کی بجائے آزاد خیالی اور مادیت پرستی کو فروغ دیا جائے، تاکہ مسلمان "رسالت محمدیؐ" کو بنیاد بنا کر اپنے معاشرے کی تشکیل نہ کرسکیں۔

اگر دور حاضر کے مغربی مفکرین (Contemporary Orientalists) کے طرز عمل کو دیکھا جائے تو مغرب کے "رسالت محمدیؐ" سے متعلق معاندانہ رویے کی حقیقت بالکل کھل کر سامنے آجائے گی، اس معاندانہ رویے کے کئی اسباب اور اس کے کئی مختلف پہلو ہیں، معاندانہ رویے کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱- مغربی مفکرین کے "رسالت محمدیؐ" سے متعلق معاندانہ رویے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کے مقابل اگر کوئی دین موجود ہے تو وہ اسلام ہے اور اسلام کی اصل روح "رسالت محمدیؐ" ہے۔

۲- مغرب کی جدید تہذیب کے سامنے اگر چیلنج کے طور پر کوئی تہذیب اور ثقافت ہے تو وہ اسلام کی تہذیب وثقافت ہے جو صدیوں پر محیط ہے اور اس تہذیب وثقافت کی اصل روح "رسالت محمدیؐ" ہے۔

۳- مغربی نیو ورلڈ آرڈر کے مقابل اگر کوئی قوت موجود ہے تو وہ اسلام کی قوت ہے اور اس قوت کا سرچشمہ رسالت ونبوت ہے۔

۴- مغرب کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور فوجی اغراض ومقاصد کے سامنے اگر کوئی قوت مقابل کے طور پر موجود ہے تو وہ اسلام ہے اور اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی

مقاصد کا عملی نمونہ رسالت محمدیؐ میں موجود ہے۔

مغرب تمام نسبتوں کے اعتبار سے یہ سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے جو چیز چیلنج کے طور پر موجود ہے وہ اسلام، اسلامی تہذیب اور مسلمان ہیں اور ان سب کی اصل روح رسالت محمدیؐ ہے، اسی لیے ہمیں تاریخ کے ہر موڑ پر یہ نظر آتا ہے کہ مغربی مفکرین نے پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں منفی رویے کا اظہار کیا، ان مفکرین کی ایک طویل فہرست ہے۔

مغربی مفکرین کے "رسالت محمدیؐ" سے متعلق معاندانہ رویے کے کئی پہلو بھی ہیں، خاص کر موجودہ دور میں، یہ مفکرین تحقیقی اسالیب کے پیرائے میں منفی رجحانات کو فروغ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عماد الدین خلیل مستشرقین کے اس طرز عمل کے منفی پہلو سے کچھ اس طرح سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

"مستشرقین اپنے مطالعات میں مورخانہ اصول تحقیق برتنے کے کیسے ہی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کریں، ایک مستشرق اپنی مغربیت اور مخصوص نقطۂ نظر کے پس منظر میں سیرت کے مطالعہ کے دوران ایک طرح کی توڑ پھوڑ کے عمل کو اپناتا ہے، خودساختہ عقلیت پسندانہ اصولوں کی روشنی میں سیرت کے جسم سے اس کی روح کو الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا اس طرح تجزیہ کرنا چاہتا ہے جس طرح سائنسی تجربہ گاہوں میں تجزیے کیے جاتے ہیں اور مذہبی احساسات سے تصادم کے ساتھ ثابت شدہ حقیقتوں کے بارے میں آشفتہ بیانیوں سے کام لیتا ہے، اس طرح کسی بھی مستشرق کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ سیرت کے بارہ میں اسلامی طرز عمل یا کوئی دوسرا سنجیدہ موقف اپنائے"۔ (۲۱)

مغربی مفکرین کے رسالت محمدیؐ سے متعلق معاندانہ رویے کا ایک پہلو "بنیاد پرستی کے نظریے" کی صورت میں موجود ہے، اہل مغرب کی نظر میں ہر وہ مسلمان بنیاد پرست ہے، جو اپنے دینی اقدار پر عمل کرتا ہو یا دینی اقدار کے تحفظ کے لیے انفرادی یا اجتماعی سطح پر کسی بھی طرح کوشش کرتا ہو۔

ڈاکٹر محمد ارشد مغربی مفکرین کے اس رویہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

"خواہ اسلامی دنیا میں جاری احیائی تحریکات کو مغرب کے لیے خطرہ

باور کرنے والا مغربی مفکرین کا طبقہ ہو یا انہیں کسی قسم کا خطرہ نہ تسلیم کرنے والا گروپ، دونوں ہی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ احیائی اسلامی تحریکات، مغرب، اس کے جدید عالمی نظام اور خود ان ممالک کے لیے جہاں وہ جاری ہیں، ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد اسلامی نظام موجودہ ترقی یافتہ دنیا کی ضروریات پوری نہیں کرتا، جس کے احیاء کی کوششوں میں یہ تحریکات مصروف ہیں، دنیا میں اسلام کا بہ طور نظام، احیائی تصور رکھنے والا اور اس کا آوازہ بلند کرنے والا خواہ اعتدال پسندوں کا طبقہ ہو یا انتہا پسندوں کا ان کے لیے موجودہ مغرب میں جو اصطلاح سب سے عام اور رائج ہے وہ ہے اسلامی بنیاد پرست (Islamic Fundamentalist) کی، اس طرح کی جتنی اور جہاں کہیں بھی تحریکات جاری ہیں، انہیں اسلامی بنیاد پرستی کا نام دیا جاتا ہے"۔(۲۲)

مغربی مفکرین کے "رسالت محمدیؐ" سے متعلق معاندانہ رویے کا ایک پہلو "تہذیبوں کے تصادم" یعنی "Clash of Civilizations" کی صورت میں موجود ہے، چند بااثر مغربی مفکرین نے "تہذیبوں کے تصادم" کا نظریہ گھڑ کر جہاں ایک طرف اسلام کو مغرب کے سامنے ایک خطرناک دشمن اور چیلنج کی صورت میں پیش کیا ہے، وہاں دوسری طرف مغرب کے تمام حکمرانوں کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ اس خطرے کے پیش نظر مسلمان ممالک پر حملہ کیا جائے، اسلامی تحریکوں کو دہشت گرد قرار دیا جائے، مسلمان ممالک کے حکمرانوں کو خرید کر وہاں پر اسلامی تہذیب دشمن کو نقصان پہنچایا جائے، ۱۹۸۵ء میں امریکی صدر رچرڈ نکسن نے ایک مضمون میں اس نظریے کی بنیاد ڈالی تھی اور لکھا تھا کہ امریکا اور روس افغانستان میں لڑ رہے ہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میں نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ امریکا اور روس کا مفاد آپس میں لڑنے میں نہیں ہے، اصل خطرہ کچھ اور ہے، اس کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہے اسلامی بنیاد پرستی کا خطرہ (۲۳)، معروف یہودی مفکر برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) جس نے نبی کریمؐ کی حیات طیبہ کے حوالے سے بھی کئی سوالات اٹھائے ہیں، اس نے ۱۹۹۰ء میں جب روسی فوجیں افغانستان سے واپس ہوئیں، امریکا کے اہم رسالے (Atlantic Monthly) میں اپنے مضمون میں پہلی بار (Clash of

Civilizations) کے الفاظ استعمال کیے (۲۴)، پھر اس نکتے کو سیموئیل ہنٹنگٹن نے آگے بڑھایا، یہ بھی ایک یہودی ہے اور ہارورڈ یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کا پروفیسر ہے، اس نے ۱۹۳۹ء میں مشہور رسالے فارن افیرز میں ایک مضمون لکھا "The Clash of Civilizations" اور پھر ۱۹۹۶ء میں تفصیل سے اپنی کتاب "Clash of Civilization and Remaking of New World Order" دنیا کے سامنے پیش کی، اس وقت یہ کتاب تہذیبوں کے نظریے کی دانش مندانہ بائبل بن گئی ہے، ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کی اپنی تقسیم میں نہ صرف اسلامی تہذیب کا تذکرہ کیا ہے بلکہ مذہب کی بنیاد پر مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان ایک آویزش اور کشمکش برپا ہونے کی پیشین گوئی بھی کی ہے، اس نے اس بات کو بھی پیش کیا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کی جڑیں موجودہ دور کی ان اسلامی تحریکات میں ہیں جو اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کرتی ہیں اور سیاسی اسلام کی وکالت کرتی ہیں۔

مغرب کے معاندانہ رویے کے کئی اور پہلو بھی ہیں جن میں مغربی اخباروں میں کارٹونوں کی اشاعت سے نبی کریمؐ کی ذات پاک، اسلام اور مسلمانوں کو تمسخر، تضحیک اور اہانت کا ہدف بنا کر اور دہشت گردی کا منبع اور علامت قرار دے کر عالمی تہذیبی جنگ کا اعلان کرنا ہے۔

۳۰؍ستمبر ۲۰۰۵ء کو ڈنمارک کے اخبار یولانو پوسٹن (Jyllands Posten) نے ۱۲ شیطانی کارٹون شائع کیے، اس پر مسلم دنیا کا ردعمل نرم رہا، آگ کو تیز کرنے اور جلتی پر تیل ڈال کر اسے مزید بھڑکانے کے لیے جنوری ۲۰۰۶ء میں ۲۲ ممالک کے ۱۵۷ اخبارات ورسائل نے انہیں شائع کیا، ۲۰۰ ریڈیو اور ٹی وی چینلوں پر انہیں دوبارہ بلکہ سہ بارہ نشر کیا گیا اور یہ سب آزادی اظہار، آزادی صحافت اور سیکولر جمہوریت کے نام پر کیا گیا، ہالینڈ کے اخبارات نے لکھا کہ ہم یہ کارٹون ہر ہفتہ شائع کریں گے، تاکہ مسلمان ان کے عادی ہو جائیں، اٹلی کے ایک وزیر نے ان کی ٹی شرٹ استعمال کی اور اسے ایک فیشن کے طور پر فروغ دینے کا پروگرام بنایا۔(۲۵)

یہ شیطانی کارٹون اتفاقی طور پر شائع نہیں ہوگئے، ان کا خاص پس منظر ہے، یولانو پوسٹن کے ثقافتی امور کے ایڈیٹر فلیمنگ روز (Flemming Rose) نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اس فکری اور تہذیبی جنگ کا آغاز کیا، اس اقدام سے ایک سال پہلے وہ امریکا گیا اور وہاں اسلام

دشمنی کی مہم چلانے والوں کے سرخیل ڈینیل پائپس سے خصوصی صلاح مشورہ ہوا، ڈینیل پائپس پچھلے چالیس سال سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے، دسیوں کتابوں اور سینکڑوں مضامین کا مصنف ہے، صہیونی تحریک میں اونچا مقام رکھتا ہے اور فلسطینیوں کے بارے میں کھلے عام کہتا ہے کہ ان کو فوجی قوت سے نیست و نابود کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، صدر بش نے اسے ایک ایسے تھنک ٹینک کا مشیر بنایا تھا جس کے مصارف سرکاری خزانے سے برداشت کیے جاتے ہیں، اس مشاورت کے نتیجے میں فلیمنگ روز نے کارٹون بنانے والے چالیس افراد کو دعوت دی اور کہا کہ تم سب موضوعات پر کارٹون بناتے ہو اور شخصیات کا تمسخر بھی اڑاتے ہو لیکن اسلام کو تم نے کبھی تختۂ مشق نہیں بنایا تو اب اسلام کا چہرہ دکھانے کے لیے اپنے برش حرکت میں لاؤ، ان چالیس افراد میں سے بارہ افراد کے کارٹون ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں "The painting of a portrait of Islam's Prophet" (پیغمبر اسلام کی تصویر کا خاکہ) کے عنوان سے شائع کیے گئے اور اس دعوے سے کیے گئے کہ اس طرح سے مسلمانوں کی تنگ نظری کا علاج ہو سکے گا (۲۶)، اسی طرح اصل کارٹونسٹ کرٹ ویسٹر گارڈ (Kurt Westerguard) کا بیان لندن کے اخبارات میں ۱۸ر فروری ۲۰۰۶ء کو شائع ہوا ہے، ہیرالڈ نامی رسالے کے استفسار پر اس نے صاف کہا کہ کارٹونوں کا اصل محرک یہ دکھانا ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام (نعوذ باللہ) دہشت گردی کی علامت ہیں۔ (۲۷)

بہر حال یہ تمام تر طرز عمل مغرب کے اس معاندانہ رویے کا عکاس ہے جو صدیوں سے رسالت محمدیؐ سے متعلق چلا آرہا ہے، مغرب کے رسالت محمدیؐ سے متعلق معاندانہ رویے کے بارے میں خرم مراد صاحب نے اہم تجزیہ کچھ یوں پیش کیا ہے:

"آج بھی رسالت محمدیؐ مغرب کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہے جہاں موقع ملے ذات گرامی پر بھی گندگی ڈالنے سے اجتناب نہیں لیکن اب یہ کام بالعموم مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والے گنتی کے چند سلمان رشدی (بھارتی نژاد شاتم رسول) اور تسلیمہ نسرین (بنگالی نژاد دریدہ دہن) قسم کے لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے، اسلوب بدل دیا گیا ہے، اب کچھ لوگ حضورؐ کو پیغمبر، کچھ لوگ وحی کی حقیقت اور نوعیت ہی کو، مکالمہ اور مفاہمت کے نام پر، بدلنے کی دعوت دے رہے

ہیں، کچھ سینٹ پال (م:۶۴ء) کی طرح کے "مصلح" کے ورود (از قسم، مرزا غلام احمد قادیانی م:۱۹۰۸ء) کے متمنی ہیں جو اسلامی شریعت سے نجات دے"۔ (۲۸)

کچھ چاہتے ہیں کہ قرآن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ایک حصہ عقائد و اخلاق کی تعلیم پر مبنی، اس کو کلام الٰہی مان لیا جائے، دوسرا حصہ زندگی بسر کرنے کے ضوابط پر مشتمل، ان کو حضورؐ کی تصنیف قرار دیا جائے، جو قابل تغیر و تبدل ہے، اسی ذیل میں کچھ دور اندیش عناصر کسی دینی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے لیکن وہ انسانی حقوق، عورت کے مقام اور جمہوریت کے نام پر وہ چیزیں دل و دماغ میں اتار رہے ہیں اور امت محمدیؐ کی زندگی اور عمل کو ایسے سانچے میں ڈھال رہے ہیں جو رسالت پر ایمان اور ناقابل تغیر و تبدل حق پر یقین کو خود بہ خود بے معنی اور غیر موثر کر کے رکھ دے۔ (۲۹)

رسالت محمدیؐ سے متعلق اہل مغرب کے معاندانہ رویے کے کئی اور پہلو بھی ہیں:

۱- عصر حاضر کے مستشرقین کا اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں پر بے بنیاد الزامات لگانا کہ مسلمان بنیاد پرست، دہشت گرد، انتہا پسند اور فاشسٹ ہیں۔

۲- عیسائی دنیا کے مذہبی پیشوا پوپ بینڈکٹ کا ۲۰۰۶ء جرمنی میں اسلام کو ہدف تنقید بنانا اسی رویے کا اظہار ہے، پوپ نے اپنے لیکچر میں اسلام کے تصور جہاد کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور اس کے ساتھ عیسائیت کو متحد رہنے کی تلقین کی کہ اس طرح اسلام کو شکست دی جا سکے۔

۳- بھارتی نژاد شاتم رسول سلمان رشدی کو ملکہ برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب دیا جانا دراصل "حوصلہ افزائی اور معاوضہ" ہے جو سلمان رشدی کو اس کردار کی نسبت سے ملا ہے جو اس نے "Stanic Verses" لکھ کر پیش کیا ہے۔

۴- اگر وسیع پیرائے میں دیکھا جائے تو اقوام متحدہ کا قیام، یورپی یونین کا قیام، نیٹو (NATO) کے عنوان سے مغرب کا فوجی اتحاد، نام نہاد دہشت گردی کے خلاف مغرب کی جنگ، مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی، بدنام زمانہ امریکی جیلوں میں قرآن مجید کی بے حرمتی، امریکی صدر بش کا اسلام مخالف جنگوں کو صلیبی جنگوں کا نام دینا، گستاخانہ خاکوں کی اشاعت، قرآن مخالف فلموں کی تیاری، مسلمان ممالک کے تعلیمی نظام سے اسلامی تعلیمات کے اخراج کا مطالبہ،

حدود اللہ میں ترامیم کا مطالبہ، قانون ناموس رسالت کو ختم کرنے کا مطالبہ اور اس طرح کے دیگر کئی اقدامات مغرب کے منفی رویے کا اظہار ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے عداوت کا نتیجہ ہیں۔

یہ تمام تر مغربی معاندانہ رویے بالکل واضح انداز میں ہمارے سامنے موجود ہے، اس تمام تر صورت حال کے تناظر میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور رسالت محمدیؐ سے متعلق کون سے اقدامات عملاً اٹھائے جائیں، تاکہ جہاں ہم ایک طرف بہتر طریقے سے رسالت محمدیؐ کو رہنمائی کا ذریعہ جان کر اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اصلاح اور استحکام لاسکیں اور دوسرا مغرب کے ان وسیع معاندانہ رویوں کا تمام تر پہلوؤں کے اعتبار سے مقابلہ کرسکیں، اس سلسلے میں چند اہم تجاویز درج ذیل ہیں:

۱- مسلمان علم و تحقیق کے بڑے بڑے مراکز قائم کریں جس میں ایک طرف اسلامی علوم پر تحقیق ہو اور اسلام، اسلامی تہذیب اور رسالت محمدیؐ سے متعلق امور کو علمی اور تحقیقی انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ مغربی محققین کی تحقیقات کا علمی انداز میں تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے اور ان کے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے متعلق منفی رویوں کا جواب دیا جائے، ان ہی تحقیقی مراکز سے مسلمانوں کا نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے اور اس نصاب کی اساس قرآن اور تعلیمات نبویؐ ہوں۔

۲- مسلمان اہل علم ایک ایسا پلیٹ فارم ترتیب دیں جس سے پوری دنیا کے مسلمان اہل علم وابستہ ہوں اور پھر اس کے ذریعے مسلمان اہل علم اپنی انفرادی کوششوں کو اجتماعی قالب میں ڈھالیں، اس طرح کا پلیٹ فارم OIC کے تحت بھی قائم کیا جاسکتا ہے یا رابطہ عالم اسلامی کی طرح کا کوئی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے جو مخصوص مقاصد کا حامل ہو۔

۳- بدلتے عالمی حالات کے پیش نظر میڈیا کی اہمیت بہت نمایاں ہے، مسلمان ممالک مل کر ایسے میڈیا چینل ترتیب دیں جو مسلمانوں کی افکار اور تہذیب کے خصائص کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بن سکیں۔

۴- مسلمان اہل علم مغرب کے معاندانہ رویوں کے جواب میں جہاں تنقیدی اسلوب اپنائیں وہیں پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کے فروغ کے لیے بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں

دونوں میں حکمت اور دانائی کے ساتھ کام کریں، تاکہ لوگ اسلام اور تعلیمات مصطفویؐ سے اچھے آشنا ہوجائیں کہ مغرب کے منفی رویوں کا ان پر کچھ اثر ہی نہ ہو۔

۵- رسالت محمدیؐ کے حوالے سے سب سے اہم نوعیت کا پہلو یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں تعلیمات نبوی کو عملی طور پر اپنائیں اور اپنے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی معاملات کو تعلیمات نبوی کی روشنی میں "نظام" کی صورت میں قائم کرنے کی کوشش کریں تو پھر مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی رویے مثبت ہوں گے، اس لیے کہ وہ ایک ایسے نظام میں بہ حیثیت مجموعی زندگیاں بسر کررہے ہوں گے جہاں کا نظام اسلام کے اصولوں کے مطابق وضع کیا گیا ہوگا اور دوسری طرف مسلمان اس پوزیشن میں بھی ہوں گے کہ وہ بہتر طریقے سے مغرب کے معاندانہ رویوں کا جواب دے سکیں۔

ماخذ

(۱) النحل ۱۶: ۴۴۔ (۲) آل عمران ۳: ۳۱۔ (۳) الاحزاب ۳۳: ۲۱۔ (۴) الاعراف ۷: ۱۵۷۔ (۵) الحشر ۵۹: ۷۔ (۶) النساء ۴: ۱۰۵۔ (۷) الشوریٰ ۴۲: ۱۵۔ (۸) النور ۲۴: ۵۱۔ (۹) النساء ۴: ۶۵۔ (۱۰) الاحزاب ۳۳: ۳۴۔ (۱۱) آل عمران ۳: ۳۱۔ (۱۲) ایڈورڈ سعید، اورینٹلزم (اس کتاب میں استشراقی تحریک کا پورا تعارف موجود ہے)۔ (۱۳) سینٹ جان آف دمشق (م ۷۵۳ء)، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م ۷۲۰ء) سے قبل اموی دربار میں اعلا عہدے پر فائز تھا اور اسلام سے ناواقف نہیں تھا۔ (۱۴) اسلام اور مستشرقین جلد سوم، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ، یوپی ہند، ۲۰۰۳ء، ص ۶۹۔ (۱۵) ایضاً، ص ۶۹ و ۷۰۔ (۱۶) پیر کرم شاہ، ضیاء النبی ۶/۱۴۱، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۸ھ۔ (۱۷) علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبی ۱/۵۹، الفیصل ناشران لاہور۔ (۱۸) ایضاً، ص ۶۰۔ (۱۹) ایضاً، ص ۶۳۔ (۲۰) ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، عربی اسلامی علوم اور مستشرقین، ۷، ۴، توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ، بہار انڈیا، ۲۰۰۴ء۔ (۲۱) ڈاکٹر محمد ارشد، مغرب اور اسلامی بنیادی پرستی، ۱۹، کاشف پبلیشرز، لاہور۔ (۲۲) پروفیسر خورشید احمد، تہذیبوں کا تصادم، حقیقت یا واہمہ، ترجمان القرآن، لاہور، مئی ۲۰۰۶ء۔ (۲۳) ایضاً۔ (۲۴) ایضاً، ص ۷۔ (۲۵) ایضاً، ۸ و ۹۔ (۲۶) ایضاً، ص ۹۔ (۲۷) خرم مراد، اسلام اور مغرب، فیصلہ کن مسئلہ، نبوت محمدیؐ، منشورات منصورہ، لاہور۔ (۲۸) ایضاً۔

مولانا سعید انصاری نشتر

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مولانا سعید انصاری کی شخصیت متنوع اوصاف و امتیازات کا مجموعہ تھی، وہ بلند پایہ عالم، مصنف، محقق، مورخ اور نامور ادیب و انشا پرداز تھے، اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، دارالمصنفین کے رفیق، رسالہ ہندوستانی الہ آباد اور ماہنامہ فاران بجنور کے مدیر رہے، اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کی ادارت سے بھی منسلک رہے، کئی کتابیں اور متعدد گراں قدر علمی و تحقیقی مضامین ان کے قلم سے نکلے، درس و تدریس پر بھی مامور ہوئے، مختلف اداروں سے وابستہ ہوئے اور مختلف النوع خدمات انجام دیں، سید زوار حسین نے ان کی زندگی ہی میں ان کے حالات اور خدمات کا ذکر اپنی کتاب ''مصنفین اردو'' میں کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

''انصاری صاحب بامذاق اور روشن خیال عالموں اور بلند فکر ادیبوں میں سے ہیں، قدرت کی طرف سے سلجھا ہوا دماغ اور سلیس زبان و قلم پایا ہے، انداز بیان متین و شستہ ہے، طرز تحریر میں سرسید اور شبلی کے ملے جلے رنگ کے حامل ہیں، جس سے آپ کی تحریریں بہت دل چسپ ہو جاتی ہیں، علاوہ ازیں عربی کے بہت اچھے ادیب بھی ہیں، علمائے مصر و یورپ سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں''۔(۱)

افسوس کہ ایسے جامع شخص کے نقوش گردش ایام نے دھندلا کر دیے، زیر نظر مضمون میں ان کے سوانح، علمی و تحقیقی کام اور اس کی قدر و قیمت کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

خاندان اور وطن: سعید انصاری صاحب فتح پور ہسوہ کے رہنے والے تھے، ان کا ددیہالی

ادب کدہ، مہراج پور، انورگنج، اعظم گڈھ، ۲۷۶۰۰۱۔

سلسلہ نسب میزبان رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، جب کہ ننہالی جد امجد حضرت جنید بغدادیؒ تھے۔

اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ عبداللہ خطیب ۹۸۳ھ میں ہندوستان وارد ہوئے اور فتح پور میں خطیب کے عہدے پر متمکن ہوئے اور عہد اکبر سے آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر تک اس منصب پر یہ خانوادہ فائز رہا۔(۲)

پیدائش اور تعلیم: محلہ خیلداران فتح پور ہسوہ میں ۱۶/ فروری ۱۸۹۴ء میں بہ روز جمعہ بوقت صبح صادق مولانا سعید انصاری نے آنکھیں کھولیں، اختر علی ان کا تاریخی نام ہے، ان کی تمام تر تعلیم کان پور کے مدارس میں ہوئی، ۱۹۰۲ء میں جامع العلوم کان پور میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں درسیات کی تکمیل کی پھر مدرسہ الٰہیات میں داخل ہوئے، ۱۹۱۵ء میں تعلیم سے فراغت پائی، حضرت مولانا شاہ محمد افضل بخاری کے ہاتھوں دستار بندی ہوئی، ان کے اساتذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، مولانا عبد العلی قاسمیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شمس العلما مولانا محمد اسحاق ہردوانی، مولانا محمد رشید صدیقی کان پوریؒ، مولانا محمد مشتاق احمد کان پوریؒ وغیرہ۔(۳)

علامہ شبلیؒ ۱۹۱۱ء میں مدرسہ الٰہیات کان پور تشریف لائے تو تبرکاً ان سے قرآن پاک کا درس لیا، بعد میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ سے بھی استفادہ کیا۔

دارالمصنفین میں: ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جب دارالمصنفین کے کاموں کا آغاز کیا تو سعید انصاری صاحب نے فروری ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین کی رفاقت قبول کی اور ۱۹۲۱ء تک اس سے وابستہ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف میں منہمک رہے، یہاں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''تفسیر ابو مسلم اصفہانی'' کی تدوین ہے، اس نایاب تفسیر کے اقتباسات کو امام رازیؒ کی تفسیر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا اور کتابی صورت میں مرتب کیا، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

''خوشی کی بات ہے کہ رفقائے دارالمصنفین میں مولوی محمد سعید انصاری نے اس

اہم کام کو اپنے ذمہ لیا اور امام رازیؒ کی تفسیر کو جو تقریباً دس ہزار صفحات کی کتاب ہے چار مرتبہ حرفاً حرفاً پڑھ کر ابو مسلم کے تمام اقوال جمع کیے اور ان کو ایک رسالے کی صورت میں مرتب کیا، جس سے اس قدیم تفسیر کا نہایت ضروری حصہ ہمارے سامنے آگیا، یہ کام اگرچہ ۱۹۱۶ء میں مکمل ہو چکا تھا، تاہم اس کی طباعت کا اب سامان ہوا ہے"۔(۴)

اسے دار المصنفین نے ۱۹۲۱ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

مولانا سعید انصاری کو عربی زبان و ادب پر بڑا عبور حاصل تھا، مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیتھ، ڈاکٹر احمد زکی ابوشادی اور شیخ تقی الدین ہلالی ان کی عربی نثر اور طرز نگارش کو پسند کرتے تھے۔(۵)

ان کی عربی دانی میں مہارت ہی کی وجہ سے ۱۹۱۷ء میں پروفیسر مارگولیتھ نے انہیں جمعیۃ آداب اللغۃ العربیہ لندن کا رکن منتخب کیا(۶)، اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے انجمن عربی صوبہ متحدہ الہ آباد کے بھی رکن بنائے گئے، اسی زمانہ میں جمعیۃ العلماء کے بھی رکن منتخب ہوئے(۷)، ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ ملیہ علی گڑھ کا تاریخ اسلام کا اعزازی پروفیسر منتخب کیا۔(۸)

دار المصنفین میں ان کا دوسرا اہم کارنامہ "سلسلۂ سیر الصحابہؓ" کی تدوین میں حصہ ہے، دار المصنفین کا یہ سلسلہ جس کے سرخیل مولانا عبدالسلام ندویؒ تھے، گیارہ حصوں پر مشتمل ہے، جس میں صحابہ کرامؓ اور ان کے عہد مبارک کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کی تفصیل ہے، اس کے تین اہم حصے مولانا سعید انصاری کے قلم سے ہیں، یہاں ان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱-سیر الصحابیات: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کی ابتدا میں صحابیاتؓ کے حالات، سوانح اور ان کے مذہبی، سیاسی اور علمی و عملی کارناموں کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، پھر عام صحابیاتؓ کے ساتھ ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کی مقدس زندگیوں کے نقوش ابھارے گئے ہیں، فاضل مصنف نے یہ کتاب اگرچہ تذکرہ نگاری کے انداز میں لکھی ہے لیکن اس سے صحابیاتؓ کی پوری مذہبی، سیاسی اور تمدنی تاریخ بلکہ اس عہد سعادت کے اہم نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ صحابیاتؓ نے جس عزم و استقلال، جوش اور حمیت کے ساتھ جہاد و غزوات میں اپنی

خدمات انجام دیں، جس طرح سیاسی معاملات میں مفید مشورے دیے اور اسلامی علوم و فنون کی جس طرح خدمت انجام دی، صنعت و حرفت، کتابت، تجارت وغیرہ میں جس قدر حصہ لیا، اس کی پوری تفصیل فاضل مورخ نے پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام ہی پہلا مذہب ہے، جس نے عورتوں کو مردوں کے مساوی درجہ دیا، ان کے حقوق متعین کیے اور انہیں مکمل عزت و احترام عطا کیا، دوسرے مذاہب اور تمدن میں مردوں کی بالادستی ہمیشہ قائم رہی مگر اسلام نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی وسائل ترقی میں شامل کیا، مولانا سعید انصاری لکھتے ہیں:

"اسلام سے پہلے دنیا نے جس قدر ترقی کی تھی، مصر، بابل، ایران، یونان اور ہندوستان مختلف عظیم الشان تمدن کے چمن آراء تھے لیکن ان میں صنف نازک کی آبیاری کا کچھ دخل نہ تھا، اسلام آیا تو اس نے دونوں صنفوں (مرد و عورت) کی جد و جہد کو وسائل ترقی میں شامل کر لیا، اس لیے جب اس کے باغ تمدن میں بہار آئی تو ایک نیا رنگ و بو پیدا ہوگیا"۔(۹)

دوسرے مذاہب میں عورتوں کی حیثیت کا اسلام سے موازنہ کرنے کے بعد مولانا سعید انصاری اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "اسلام کا نقطۂ نظر ان سب سے جداگانہ ہے، وہاں عورت نسیم اخلاق کی نکہت اور چہرۂ انسانیت کا غازہ سمجھی جاتی ہے"(۱۰)، اس کتاب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"اگر ہماری بہنیں اور بیٹیاں اس کتاب کو اپنی زندگی کا نمونہ بنائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ دین داری، خدا ترسی، پاکیزگی، عفت اور صلاح و تقویٰ کے ساتھ وہ دنیا کو کیوں کر نباہ سکتی ہیں اور دنیا و آخرت دونوں کی نیکیوں کو اپنے آنچل میں کیسے سمیٹ سکتی ہیں"۔(۱۱)

۲-سیر انصار-اول: اس میں ۱۵۱ر انصار کرام کے حالات و سوانح، ان کے فضل و کمال، اخلاق و عادات، عبادات و مجاہدات کی تفصیل مستند ماخذوں سے اس طرح قلم بند کی گئی ہے کہ اس عہد کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ سامنے آجاتی ہے، گو یہ پوری کتاب مصنف کی جاں کاہ محنت اور دیدہ ریزی کا نمونہ ہے، تاہم ان کا اصل کارنامہ کتاب کا مبسوط مقدمہ ہے، جو

نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا گیا ہے، اس میں انصار کی ماقبل اسلام اور مابعد اسلام کی مفصل تاریخ، ان کے شجرۂ نسب، تمدن و معاشرت اور اخلاق و عادات کی ایک ایک تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے، ان کا خیال ہے کہ ''انصار قحطانی نہیں بلکہ نابط بن اسماعیل کی اولاد ہیں یعنی وہ عرب عاربہ نہیں مستعربہ ہیں'' (۱۲) قرآن و حدیث، اشعار عرب اور روایت و درایت کی بنیاد پر انہوں نے یہ رائے قائم کی ہے اور انصار کی تاریخ نابطہ کے عہد سے شروع کی ہے۔

قبل از اسلام کی تاریخ کے بعد، بعد از اسلام کی انصار کی جو تاریخ مولانا سعید انصاری نے لکھی ہے، اس میں انصار کی خدمات کا مفصل ذکر کیا ہے، ان کے اولیات کا بھی ذکر ہے، اذان کی ابتدا کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اس مقام پر یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ اذان جو درحقیقت نماز کا دیباچہ اور اسلام کا شعار اعظم ہے، ایک انصاری کی رائے سے قائم ہوئی اور یہ وہ شرف ہے جو انصار کے ناصیہ کمال پر ہمیشہ غرہ عظمت بن کر نمایاں رہے گا''۔ (۱۳)

فاضل مصنف نے ان تمام تاریخی واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جس میں کسی نہ کسی نوع سے انصار کی شمولیت تھی اور بلاشبہ ابتدائے اسلام میں انصار نے اخوت اور بھائی چارگی کا جو تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا اور جس کی مثال دنیا کی کسی قوم کی تاریخ نہیں پیش کرسکتی، اس کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔

صحابہ کرامؓ کا یہ تذکرہ، تذکرہ نگاری کا بھی عمدہ نمونہ ہے، یہاں اس سے ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے مصنف کے اسلوب تذکرہ نگاری اور ان کے ادب و انشاء کا بھی اندازہ ہوگا، حضرت ابوایوب انصاریؓ میزبان رسولؐ تاریخ اسلام کا ایک تابندہ نقش اور فاضل مصنف کے مورث اعلا ہیں، ان کے تذکرے میں ذیلی عنوان حامل نبوت کی میزبانی کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اب ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیے میزبان دو عالم کی مہمانی کا شرف کس کو حاصل ہو، جدہر سے آپ کا گزر ہوتا لوگ اہلاً وسہلاً مرحبا کہتے ہوئے آگے بڑھتے اور عرض کرتے کہ حضور یہ گھر حاضر ہے لیکن کارکنان قضا و قدر نے اس شرف کے لیے جس گھر کو تاکا تھا وہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا کاشانہ تھا،

آنحضرتؐ نے لوگوں سے فرمایا ''اونٹنی کو آزاد چھوڑ دو، وہ خدا کی جانب سے خود منزل تلاش کرلے گی......'' امام مالکؒ کا قول ہے کہ اس وقت آنحضرتؐ پر وحی کی حالت طاری تھی اور آپؐ اپنے قیام گاہ کی تجویز میں حکم الٰہی کے منتظر تھے، آخر ندائے وحی نے تسکین کا سرمایہ بہم پہنچایا اور ناقہ قصوا نے خانہ ابوایوبؓ کے سامنے سفر کی منزل ختم کی...... ابوایوبؓ کو اس فخر لازوال کے حصول سے جو مسرت ہوئی، اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے''۔ (۱۴)

۳-سیر انصار-دوم: اس حصہ میں بہ ترتیب حروف تہجی ۲۴۷ انصار کرام اور انصار کے ۱۷ خلفا کے سوانح زندگی، فضائل و مناقب، اخلاق و عادات، طرز معاشرت نیز ان کے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی کارناموں کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔

ان دونوں حصوں سے انصار کرام کی پوری تاریخ اور اسلام کے اس تابناک عہد کی ایک نمایاں تصویر سامنے آجاتی ہے، فاضل مصنف نے یہ کتابیں مستند ماخذ اور نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھی ہیں جو یقیناً ان کا بڑا کارنامہ ہیں۔

یہ تینوں کتابیں دارالمصنفین نے علی الترتیب ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء میں شائع کی، اس وقت سے برابر شائع ہورہی ہیں اور بہت مقبول ہیں، ان کا ترکی زبان میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے، اس سے ان کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مضامین معارف: جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاذ کی خواہش کے مطابق ماہنامہ ''معارف'' جاری کیا، اس وقت دارالمصنفین میں ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندویؒ، مولانا حاجی معین الدین ندویؒ اور مولانا سعید انصاریؒ تصنیف و تالیف میں مصروف تھے، چنانچہ ان حضرات نے معارف کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولانا سعید انصاریؒ کے بارے میں اسی وقت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا تھا کہ

''مولوی محمد سعید انصاریؒ انہوں نے کان پور کے مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن قدرت کی فیاضیاں دشت و چمن میں ہر جگہ یکساں نظر آتی ہیں، تقریباً ایک سال سے دارالتصنیف میں قیام پذیر ہیں...... ان کی تحریریں

عام اخبارات اور خود معارف میں نکلتی ہیں، ان سے معلوم ہوگا کہ آئندہ ان سے
کیا توقع کی جاسکتی ہے"۔(۱۵)

چنانچہ سید صاحبؒ کی توقع پر انصاری صاحبؒ کھرے اترے اور وہ جب تک
دارالمصنفین سے وابستہ رہے، تصنیف و تالیف اور تحقیق میں مصروف رہے، کتابوں کے علاوہ
مختلف النوع موضوعات مثلاً قرآن وحدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ اسلام، فلسفہ وکلام، تذکرہ وسوانح،
طب، سائنس، فنون لطیفہ اور لسانیات وغیرہ پر متعدد علمی و تحقیقی مضامین معارف میں لکھے، یہاں
ان کی ایک فہرست نقل کی جارہی ہے، اس سے ان کے علم وتحقیق کا اندازہ ہوگا۔

[۱] تورات اور شریعت حمورابی، ایک الزامی جواب، اگست ۱۹۱۹ء۔ [۲] قرآن مجید
میں بائبل کے حوالے، جنوری ۱۹۱۸ء۔ [۳] ابومسلم اصفہانی اور ان کی تفسیر، جنوری ۱۹۱۸ء۔
[۴] الجزیہ، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۱۵ء۔ [۵] فن منطق کی مختصر تاریخ، جنوری وفروری ۱۹۱۷ء۔
[۶] استدلال، اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ [۷] فلسفۂ طبیعی کے حیرت انگیز اکتشافات، دسمبر ۱۹۱۶ء۔
[۸] یونانی تمدن، اپریل ۱۹۲۰ء۔ [۹] مسلمانوں کا دور تنزل ختم ہوگیا، اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ [۱۰] غازیہ
اسلام ام سلیم، ستمبر ۱۹۲۱ء۔ [۱۱] حکیم ابن زکریا رازی چیچک کے علاج کا موجد، جولائی ۱۹۱۶ء۔
[۱۲] چارلس ڈارون، جنوری ۱۹۲۰ء۔ [۱۳] حضرت خبیب بن عدیؓ (سولی پر اسلام کی پہلی لاش)،
اپریل ۱۹۱۷ء۔ [۱۴] سعد بن معاذ، مارچ ۱۹۱۸ء۔ [۱۵] حضرت سعد بن ارارۃ، اپریل ۱۹۱۸ء۔
[۱۶] ابوالفداء کے حالات ابوالفداء کے قلم سے، جون تا ستمبر ۱۹۱۸ء (چار قسطیں)۔ [۱۷] کلدانی
تمدن، اکتوبر ۱۹۱۹ء۔ [۱۸] ایران، فروری ۱۹۲۰ء۔ [۱۹] مصریوں کے علاوم اور عمرانیات تمدن،
جون ۱۹۱۹ء۔ [۲۰] مسئلہ خلافت اور شاہان اسلام، اگست ۱۹۲۱ء۔ [۲۱] آثار قنوج، جنوری
۱۹۲۳ء۔ [۲۲] ہندوستان کا قدیم علم وفضل، دسمبر ۱۹۱۹ء۔ [۲۳] فلسفہ عروج وزوال اسلام، مئی
۱۹۲۰ء۔ [۲۴] تسہیل البلاغت، اکتوبر ۱۹۲۱ء۔ [۲۵] قدیم اور جدید علم ہیئت، دسمبر ۱۹۲۰ء۔
[۲۶] انگریزوں کی ترقی کا راز، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۲۱ء۔ [۲۷] نقود العرب قبل الاسلام،
نومبر ۱۹۱۸ء۔ [۲۸] اردو میں علم الصرف کی پہلی کتاب، ستمبر ۱۹۱۷ء۔ [۲۹] پدماوت کا مصنف
کون تھا؟ نومبر ۱۹۳۳ء۔ [۳۰] عربی منطق کی تاریخ، اگست ۱۹۱۷ء۔

دارالمصنفین کے زمانہ قیام کا ان کا ایک اور اہم کام مولانا سید سلیمان ندویؒ کی معرکہ
آرا کتاب "خیام" کا انڈکس تیار کرنا ہے، آج اشاریہ سازی عام ہے لیکن اس دور میں یہ کام
بالکل نیا تھا، غالباً مولانا سعید انصاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے کسی کتاب کا انڈکس تیار کیا جس
کی سید صاحب نے بھی تعریف کی ہے۔(۱۶)

محمد الدین فوق مالک صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین پنجاب اس
زمانہ میں علمی و مذہبی اور بلند پایہ کتابیں شائع کرنے کے لیے مشہور تھے، انہوں نے ملک کے
متعدد نامور اہل قلم کی خدمات حاصل کرلی تھیں، مولانا عبدالسلام ندویؒ کی بھی کئی کتابیں مثلاً
تاریخ الحرمین الشریفین، فقرائے اسلام وغیرہ انہوں نے شائع کیں، نیاز فتح پوری اور بعض
دوسرے اہل قلم کی تصنیفات بھی اس کمپنی نے شائع کیں، ضرورت ہے کہ اس کی کاوشوں اور
خدمات کی تفصیل بھی قلم بند ہو، اس کمپنی نے ۱۹۲۳ء میں مولانا سعید انصاریؒ کی خدمات حاصل
کرلی اور اعزازی مشیر بنایا، چنانچہ مولانا سعید انصاریؒ نے اس کے لیے کئی کتابیں لکھیں،
سیر الصحابہ اسی زمانہ کی یادگار رہے، جس میں حضرات شیخین کے مفصل حالات اور ان کے تابناک
عہد کی تاریخ کے ساتھ ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل کتاب ہے، مقدمہ میں فن روایت و درایت و
رجال پر نقد وتبصرہ کیا گیا ہے، نیز اس فن کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے (۱۷)،
جس سے نہ صرف روایت و درایت کی حقیقت اور اس کی تاریخ سامنے آجاتی ہے بلکہ مصنف کے
مورخانہ شعور کی بلندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

تدریس: مولانا سعید انصاریؒ نے مختلف اوقات میں درس و تدریس کا شغل بھی اختیار کیا،
دارالمصنفین سے ترک تعلق کے بعد ۱۹۲۷ء میں حلیم مسلم ہائی اسکول کان پور کے ہیڈ مولوی بنائے
گئے، ۱۹۳۰ء میں بی-این-ایس-ٹی کالج کے شعبہ اردو سے بہ طور لکچرر وابستہ ہوگئے، غالباً تدریس
انہیں راس نہیں آئی، چنانچہ ۱۹۳۲ء میں دوبارہ دارالمصنفین آئے اور دو تین برس تک تصنیف و
تالیف میں منہمک رہے مگر اس دفعہ وہ چند مضامین کے علاوہ کوئی علمی کاوش پیش نہ کرسکے۔

رسائل کی ادارت: انصاری صاحب مختلف اوقات میں مختلف رسائل و جرائد کے
مدیر رہے اور اپنی علمی صلاحیتوں سے انہیں بڑی ترقی دینی چاہی، ۱۹۳۵ء میں دارالمصنفین سے

دوبارہ علاحدگی کے بعد بجنور چلے گئے، اسی سال اخبار مدینہ بجنور کے مالک مولوی مجید حسن نے
ایک علمی رسالہ فاران نکالا تو انہیں اس کا ایڈیٹر مقرر کیا، چنانچہ مولانا سعید انصاریؒ نے معارف
کے تجربے سے فاران کو ایک علمی رسالہ بنانے کی بھرپور کوشش کی، یہاں تک کہ اس کے عنوانات
بھی مثلاً شذرات، مقالات، ادبیات اور مطبوعات جدیدہ حتی کہ صفحات (۸۰) بھی معارف ہی
کے رکھے اور اسی انداز کے مضامین اور طرز بھی اختیار کیا، اس کی فائلیں دست یاب نہیں ہو سکیں،
البتہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف میں اس پر جو تبصرہ کیا ہے (۱۸)، اس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ یہ ایک علمی و تحقیقی رسالہ تھا، دلی کے کسی رسالہ نے علامہ شبلیؒ کی تحقیقی غلطیاں کے عنوان
سے جو مضامین لکھے تھے، ان کا جواب بھی اس رسالہ میں دیا گیا ہے۔☆

فاران کے بعد وہ رسالہ علی گڑھ سے وابستہ ہوئے، پھر ایک سال بعد ہندوستانی اکیڈمی
سے منسلک ہوگئے، اسی زمانہ میں اکیڈمی کے رسالہ ہندوستانی کے مدیر اور مشہور شاعر مولانا اصغر
گونڈوی نے وفات پائی تو ان کی جگہ رسالہ کے مدیر بنائے گئے، منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:

"مولانا اصغر کی وفات حسرت آیات سے ہندوستانی اکیڈمی میں
اردو اسکالر کی جو جگہ خالی ہوگئی تھی، اس پر دار المصنفین اعظم گڈھ کے رکن مولانا
سعید انصاری کی تقرری ہوئی ہے، مولانا موصوف زمانہ کے پرانے مضمون نگار
ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ اکیڈمی کے لیے دیگر اصحاب کی نسبت زیادہ مفید ثابت
ہوں گے"۔ (۱۹)

مولانا سعید انصاری ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک ہندوستانی کے مدیر رہے اور اسے بڑی
آب و تاب بخشی، اداریے لکھے، مضامین و مقالات لکھے، کتابوں پر تبصرے اور اکیڈمی کی روداد لکھی،
غرض ہندوستانی کے نہ صرف معیار کو باقی رکھا بلکہ اہل علم کے عمدہ عمدہ مضامین شامل کر کے اس کو بڑی
مقبولیت دی، جس کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے اہل علم نے بھی کیا ہے۔ (۲۰)
ہندوستانی اکیڈمی کی مکمل فائل دست یاب نہ ہو سکی، البتہ چند فائلوں سے ان کے جو

☆ معارف: بعد میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اس رسالہ کے مدیر ہوئے، اس زمانے میں امداد صابری
صاحب کا رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" شائع ہوا تو انہوں نے بھی اس کی مدلل تردید کی۔ "ض"

مضامین مل سکے ان کے عنوان یہ ہیں:
۱- شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی ۱۹۳۸ء، ۲- بحر و رنگ ۱۹۳۸ء، ۳- برفانی اقالیم
۱۹۳۹ء، ۴- الکندی علم و فضل اور فلسفہ ۱۹۴۰ء، ۵- الکندی کی دوربین ۱۹۴۰ء، ۶- پروفیسر
مارگولیث کی وفات ۱۹۴۰ء۔

ضرورت ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی کی تاریخ اور خدمات اور اس کے رسالہ تماہی
ہندوستانی کا اشاریہ مرتب کیا جائے، اس سے عام استفادے کے علاوہ مولانا سعید انصاری کی
خدمات بھی سامنے آجائیں گی۔

جمالیاتی شاعری: الہ آباد ہی کے زمانہ قیام میں ان کے اردو کلام کا انتخاب جمالیاتی
شاعری زیور طبع سے آراستہ ہوا، مولانا سعید انصاری پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے، نشتر تخلص
کرتے تھے، انہوں نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں داد سخن دی اور دونوں زبان میں ان کے
کلام کے ایک ایک مجموعے شائع ہوئے۔

جمالیاتی شاعری ان کے اردو کلام کا انتخاب ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، یہ انتخاب خود
شاعر کا کیا ہوا ہے، اس سے پہلے یہ کام اصغر گونڈوی نے شروع کیا تھا مگر وہ اسے پایہ تکمیل تک نہ
پہنچا سکے تھے کہ خود ان کی حیات مستعار پایہ تکمیل کو پہنچی، انصاری صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۳۶ء کے دو مہینوں کی دو سے زائد نشستوں میں اصغر صاحب نے
میرا بہت سا کلام سن کر اکتالیس شعر انتخاب کیے تھے، پھر میں الہ آباد سے لاہور چلا
گیا اور ۳۰ نومبر کو اصغر صاحب وفات پا گئے، اس حادثے سے میں انتخاب کی
نسبت بالکل مایوس ہوگیا، ان کو خدا نے انتخاب کا غیر معمولی ملکہ عطا فرمایا تھا،
یکایک ۱۹۳۷ء میں مجھے پھر خیال آیا، اب یہ کام مجھ کو ہی انجام دینا پڑا"۔ (۲۱)

یہ ان کے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء تک کے کلام کا انتخاب ہے، اس میں بالقصد جمالیاتی
اشعار یکجا کیے گئے ہیں، یہ جمالیات کے مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے، صرف جمال ہی نہیں بلکہ جمال
ہم نشیں بھی ان کے کلام کا زیور ہے، واردات حسن و عشق کے بہت خوب صورت مرقعے ان کی
شاعری میں ہیں۔

انصاری صاحب کا نظریہ شعریہ ہے کہ آرٹ وہی دیرپا ہے جو سادہ ترین احساسات کا حامل اور عام فہم ہو (۲۲)، ان کے اس نظریے سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے نظریہ کی صداقت صاف ثابت ہوتی ہے، ان کے احساسات یقیناً سادہ، عام فہم اور دیرپا ہیں، وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان چند اشعار میں کچھ حقیقتیں بہت آسان لفظوں میں بیان کی گئی ہیں، تہنیت، پیغامات، طرز ادا، سب مخصوص فضا سے متاثر ہیں، میرے ملک کے پھول صرف بارش اور دھوپ سے پیدا ہوتے ہیں، اگر اس مجموعے سے لوگوں میں فطرت کے وسیع دائرے، انسان کی عظیم الشان فطرت، فلسفہ حیات کے بنیادی اصول اور رجائیت کے عالم گیر پہلوؤں کی کسی قدر زیادہ گہری جستجو کا خیال پیدا ہو تو میں اس کو حسن توفیق سمجھوں گا"۔ (۲۳)

گویا انصاری صاحب نے شعوری طور پر اپنی شاعری میں ذات و کائنات اور فلسفہ حیات کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ پیش کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ رجائیت کے عالم گیر پہلوؤں کی جستجو پیدا ہو، بہ طور نمونہ مختلف انداز کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

سوز درونِ عشق سے روشن ہو کل فضا — وہ آشیاں بنائیے جو مہر و ماہ ہو
بہت پیچھے جنوں میں سرحد ادراک کو چھوڑا — ہمیں اب جادہ منزل سے مطلب ہے نہ منزل سے
چاند کے پیچھے چمکتی ہے، ستاروں کی زمیں — حسن منظر سے بڑھا حسن اس تصویر کا
بھڑکا رہا ہے سینوں میں اک آگ عشق کی — ہاتھوں میں قیس دامن لیلیٰ لیے ہوئے
یہ زندگی ہے کہ فطرت سے جنگ پیہم ہے — یہ سلسلہ جو نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا
نقش قدم کو میرے تم ان سے بھی پوچھنا — مہتاب و کہکشاں سے اگر رسم و راہ ہو
عشق میں بھی جلوہ ہائے حسن پنہاں دیکھیے — اشک میں قوس قزح کا آپ طوفاں دیکھیے
ہوا ہوں اپنی فضا میں کچھ اس طرح تحلیل — کہ حسن و عشق میں اب فرق رہ گیا ہے قلیل
نظر کا پردۂ تاریک بھی آنکھوں پہ ڈالے ہیں — یہ اپنے دل کے اندر دل کی دنیا دیکھنے والے
چاہتا ہوں بس محبت کو ملے نشو و نما — کام کیا مجھ کو مسرت سے، غرض کیا رنج سے

خاک کی آلودگی سے پاک ہو خالص ہو جسم — اب ہماری زندگی بھی، چاہتی ہے زندگی
میں وہ ہوں محروم آزادی کہ صحن باغ میں — مجھ کو اپنا آشیانہ بھی نظر آیا قفس

مجموعی طور سے انصاری صاحب کی اردو شاعری تفریح طبع معلوم ہوتی ہے اور ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کے ہم پلہ نہیں، تاہم اس کا مطالعہ لطف و لذت سے خالی نہیں۔

دائرہ معارف اسلامیہ لاہور میں: تقسیم کے بعد ۱۹۵۰ء میں انصاری صاحب لاہور منتقل ہوگئے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کوششوں سے دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کے حلقہ ادارت میں شامل ہوئے (۲۴) اور انسائیکلوپیڈیا کے لیے متعدد گراں قدر مضامین لکھے اور ترجمے کیے جو اس میں شامل ہیں، اس کی نشان دہی کی بھی ضرورت ہے، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ انہوں نے اس عظیم الشان انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف میں کس قدر خدمات انجام دیں۔

شبلی مرکز لاہور: لاہور میں ان کا ایک کارنامہ شبلی مرکز کا قیام ہے جو انہوں نے علامہ شبلی کی یادگار میں قائم کیا تھا، اس سے انہوں نے کئی کتابیں شائع کیں، خود ان کا فارسی کلام اسی مرکز نے شائع کیا تھا، معلوم نہیں یہ ادارہ اب تک قائم ہے یا نہیں؟

غزلیات فارسی: لاہور میں انہیں اپنے فارسی کلام کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ۱۹۵۶ء میں اسے محمد سلیمان (۲۵) نے مرتب کر کے شائع کیا، اس کا دیباچہ اور حواشی داؤد بن یاسین کے قلم سے ہیں، اردو کے مقابلے میں ان کی فارسی غزلیں زیادہ رنگین، زیادہ کیف آور اور نشاط آگیں ہیں، بہ قول حاشیہ نگار اس میں شاعر کے اپنے تجربات و مشاہدات ہیں، چوں کہ شاعر کی زندگی تلخ گزری، اس لیے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا، بہ طور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نالہ بلبل مسکیں بدم خندہ گل — گریہ مہر و وفاہست از و ایں راز بگو
عاشق برفت چوں دل مسکیں از ازل — او را در عشق تا بہ ابد جاوداں کنی
ناکار خویش از آں چشم سیہ ندانی — رندی و عشق بازی ہرگز نمی توانی
تو وقت قدسیاں تشویش دہ ای نرگس رعنا — کہ وصف دل فریب سرگرانی ہست ورعنائی
چشم شوخش را کمانکش جادوی دانم کہ او — ہم بقصد جاں زار ناتواں آید ہمی
من اندر مجلس خود از شرابی آب می خواہم — کہ ایں بخت خدادادام ندیم و یاری آورد

انہیں علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور دارالمصنفین سے بڑی عقیدت تھی، ان حضرات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے، ایک شعر میں علامہ شبلی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

ہزار آواز و پیش طوطی ہندوستانی آید
سخن دانی و خوش خوانی بر شبلی نعمانی آید

انصاری صاحب کو مولانا عبدالسلام ندوی سے خصوصاً بڑی عقیدت تھی، ان کی وفات پر انہوں نے کئی مضامین لکھے اور ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی کہا ہے جس میں مولانا کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہماں عبد السلام من، قوام من، امام من — بدم دارد دم عیسیٰ، بکف دارد ید بیضا
فلاطون فن، مسیحا دم، ارسطو مغز، حافظ نغز — بحکمت ہست چوں یعقوب کندی پایہ اش بالا
بمنطق قطب شیرازی، حریف طوسی و رازی — بدانش نصر فارابی، بہ بینش بوعلی سینا
بہ سلطانی اردو ہم و دانش مسند اعظم ہست — ہماں استاذ کامل، شبلی نعمانی دانا
ہمہ داں و ہمہ گیر و ہمہ فضل و ہمہ دانش — کہ افروزد چراغ عقل خود از علم الاسماء

ان کی فارسی شاعری کی داد مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی نے بھی دی ہے۔(۲۶)

وفات: دائرہ معارف اسلامیہ کی خدمت کرتے ہوئے ۶۸ سال کی عمر میں ۴ر اکتوبر ۱۹۶۲ء میں لاہور میں وفات پائی اور لاہور ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

حوالے

(۱) مصنفین اردو، ص ۲۱۷، مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۳۹ء (۲) غزلیات فارسی سعید انصاری نشتر، ترجمہ المولف، ص ۳، شبلی مرکز لاہور، ۱۹۵۶ء۔ (۳) ماہنامہ معارف اعظم گڈہ، جولائی ۱۹۲۰ء، ص ۳۔ (۴) ایضاً۔ (۵) غزلیات فارسی ترجمہ المولف، ص ۵۔ (۶) ایضاً، ص ۶۔ (۷) ایضاً۔ (۸) ایضاً۔ (۹) سیر الصحابیات، ص ۳، دارالمصنفین اعظم گڈہ، ۱۹۳۱ء۔ (۱۰) ایضاً، ص ۴۔ (۱۱) ایضاً، طبع دوم، ص ۲۔ (۱۲) سیر انصار اول، ص ۳۔ (۱۳) سیر انصار اول، مقدمہ ص ۹۸۔ (۱۴) سیر انصار اول، ص ۱۱۰-۱۱۱۔ (۱۵) ماہنامہ معارف، ستمبر ۱۹۱۶ء، ص ۹۔ (۱۶) خیام از مولانا سید سلیمان ندوی، ص ب، دارالمصنفین اعظم گڈہ (ب-ت)۔ (۱۷) مقدمہ سیر الصحابہ از مولانا سعید انصاری، ص ۱-۱۶۹، مطبوعہ صوفی پبلشنگ کمپنی، پنجاب۔ (۱۸) ماہنامہ معارف، اگست ۱۹۳۵ء، ص ۱۵۲۔ (۱۹) زمانہ کان پور، ستمبر ۱۹۳۷ء، ص ۲۰۳ و ۲۰۴۔ (۲۰) ہندوستانی، الہ آباد، ۱۹۳۱ء، ص ۳۱۲۔ (۲۱) جمالیاتی شاعری، مطبوعہ الہ آباد، ۱۹۳۸ء۔ (۲۲) ایضاً۔ (۲۳) ایضاً۔ (۲۴) ماہنامہ معارف، نومبر ۱۹۶۲ء۔ (۲۵) محمد سلیمان صاحب کے بارے میں تفصیل معلوم نہ ہو سکی، غالباً یہ مولانا سعید انصاری کے بڑے صاحب زادے ہیں جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے، جمالیاتی شاعری، ص ۶۔ (۲۶) غزلیات فارسی ترجمہ المولف، ص ۶، شبلی مرکز لاہور، ۱۹۵۶ء۔

عراق

کلیم صفات اصلاحی*

(۲)

(سلسلہ کے لیے دیکھیں دسمبر ۲۰۰۷ء)

طوفان نوحؑ کی تباہ کاری کے بعد سرزمین عراق میں نسل انسانی کی نشو و نما کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس دور کی تاریخ کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا، اس ضمن میں اسرائیلی روایات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد نسل انسانی فقط اولاد نوحؑ حام، سام اور یافث سے چلی لیکن جیسا کہ ذیل کی بحث سے واضح ہوگا یہ خیال درست نہیں ہے، ہمارے خیال میں ان روایتوں کو شہرت اس لیے بھی حاصل ہوئی کیوں کہ دنیا کی مذہبی قیادت ایک زمانہ تک خاندان نوحؑ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت یعقوبؑ وغیرہ سمیت دنیا کے مشہور و معروف انبیا کا موروثی تعلق اسی خانوادہ سے تھا اور عوام اس خاندان سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے، اس لیے جو باتیں بنی اسرائیل نے اپنی عظمت کے سلسلہ میں بیان کیں اور جن روایتوں کو شہرت دی وہی مستند قرار پا گئیں اور یہ خیال قائم ہو گیا کہ نسل انسانی کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز اولاد نوح سے ہوا، اس طرح عقیدت کے پردے میں حقیقت مستور رہی لیکن اثری تحقیقات نے ان اور اس طرح کی دوسری اسرائیلی مرویات کی بے اعتدالی ثابت کر دی اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اس سلسلہ میں اسرائیلی روایات قابل اعتبار نہیں ہیں، قرآن مجید نے تو متعدد مقامات پر اس سچائی کو بے نقاب کیا ہے، متعلقہ آیتوں کے مطالعہ سے اسرائیلی روایات کی پر زور تردید ہو جاتی ہے، تفصیل کے لیے صفٰت، بنی اسرائیل، مریم وغیرہ کی آیتیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد نوحؑ کے ساتھ ساتھ حضرت نوحؑ کے

---

* رفیق دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔

دوسرے رفقانے بھی عراق میں نسل انسانی کی نشأۃ ثانیہ میں اہم رول ادا کیا تھا جنہیں اللہ نے کشتی میں سوار ہونے کے سبب بچالیا تھا۔

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ تباہی کے بعد اس سرزمین میں آبادی کیوں کر ہوئی اور اس خانماں برباد علاقہ کو کن لوگوں نے دوبارہ آباد ہی نہیں کیا بلکہ اعلا تہذیب وتمدن کے اس مقام پر پہنچا دیا جس سے اس عہد تک دنیا ناآشنا تھی، اثری تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ عراق کا سب سے قدیم تہذیب یافتہ شہر بابل ہے اور محققین و ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اعلا انسانی تہذیب وتمدن کا ابتدائی گہوارہ ہے، صاحب معجم البلدان نے بابل کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ طوفان کے بعد اس سرزمین میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ نے قدم رکھا۔

ویقال اول من سکنها نوح علیه السلام وهو اول من عمرها وکان قد نزلها بعقب الطوفان فسار هو ومن خرج معه من السفینة الیها لطلب الدفأ فاقاموا بها وتناسلوا فیها وکثروا من بعد نوح وملکوا علیهم ملوکا وابتنوا بها المدائن واتصلت مساکنهم بدجله والفرات (۱)

کہا جاتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح پہلے شخص ہیں جنہوں نے بابل کو آباد کیا اور وہاں فروکش ہوئے، حضرت نوح اور ان کے رفقا کشتی سے نکل کر جائے پناہ کی تلاش میں بابل پہنچے، وہیں بود وباش اختیار کی اور وہاں ان کی نسل پھلی پھولی اور حضرت نوح کی وفات کے بعد اس سرزمین میں بڑی عظمت وجلال کے بادشاہ ہوئے، جنہوں نے شہر تعمیر کیے اور ان کے مکانات دجلہ وفرات سے متصل تھے۔

سطور بالا سے معلوم ہوا کہ طوفان کے بعد عراق کے قدیم شہر بابل کو حضرت نوح اور ان کے ساتھ جو لوگ طوفان سے بچ رہے آباد کیا اور جیسے جیسے وقت گزرا حالات معمول پر آتے گئے اور لوگوں کی دماغی اور عملی قوتوں میں اضافہ ہوا جس کی بدولت انہوں نے طرز رہائش ا معاشرت کو اعلا مقام پر پہنچا دیا، آئندہ سطروں میں ان قدیم قوموں اور سلطنتوں کا بالاجمال تذکرہ کیا جائے گا جن کے نام سے اس عہد کا تمدن منسوب ہے، قبل اس کے کہ اس موضوع کو آگے بڑھایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقوام عالم کے ان خصایص کا مختصراً جائزہ لیا جائے جن سے قوموں کی شناخت قائم ہوتی ہے، ماہرین نے ان کی تلاش وتحقیق میں بڑی دیدہ ریزی سے

کام لیا ہے، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سامیوں نے اس علاقہ کو پہلے پہل آباد کیا۔

ماہرین علم الاقوام والالسنہ نے دنیا کی قوموں کی تقسیم زبان، جسمانی خصائص، عادات و ذہنی میلانات یعنی مذاق طبیعت کے لحاظ سے کی ہے (۲)، طبقات الامم کے مصنف صاعد اندلسی نے لکھا ہے کہ پچھلے زمانہ یعنی قبائل کی تقسیم اور زبانوں کے اختلاف سے قبل لوگ سات قوموں میں منقسم تھے، ان سات قوموں میں کلدانیوں کے متعلق رقم طراز ہے کہ کلدانیوں کو سریانی اور بابلی بھی کہتے ہیں، ان کی متعدد شاخیں تھیں، اشور، کوثابی، ارمانی اور جرامقہ وغیرہ جو موصل اور نبط یعنی سواد عراق میں آباد تھیں، ان قوموں کے شہر عراق، الجزیرہ (میسوپوٹیما) جو دجلہ وفرات کے مابین دیار ربیعہ ومضر کے نام سے مشہور ہے، شام اور جزیرۃ العرب حجاز، نجد، تہامہ، غور اور یمن کے درمیان واقع ہیں اور کسی زمانہ میں زبید سے لے کر عدن، عروض، حضرموت اور عمان بلاد عرب تک کے جملہ علاقے ایک ہی حکمراں کے زیر اثر تھے اور وہاں کی زبان سریانی تھی (۳)، پھر سریانی سے عبرانی زبانیں پیدا ہوئیں، عبرانیوں یعنی بنی اسرائیل نے شام میں سکونت اختیار کی اور عربوں نے الجزیرہ (میسوپوٹیما) اور جزیرۃ العرب کو آباد کیا اور سریانیوں یعنی کلدانیوں میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے، عراق کی طرف چلے اور عراق میں ان کا عظیم الشان پایہ تخت شہر کلوازی تھا۔ (۴)

بابلی زبان کی اصل کے متعلق محققین نے لکھا ہے کہ یہ زبان سامی الاصل ہی نہیں بالکل عربی ہے اور اس کے طرز وانداز اور الفاظ وغیرہ میں انتہائی گہری مناسبت ہے، ماہرین نے بابلی زبان کے کتبوں کا مطالعہ کیا اور بابلی زبان اور موجودہ عربی زبان کے الفاظ کا باہم موازنہ ومقارنہ کیا تو معلوم ہوا کہ بابلی زبان کے اکثر الفاظ موجودہ عربی الفاظ کے بالکل ہم معنی ہیں اور جس مفہوم میں وہ الفاظ عہد بابلی میں بولے جاتے تھے معمولی فرق کے ساتھ آج بھی اسی معنی ومفہوم میں ادا کیے جاتے ہیں، مثلاً بابلی میں اب، ابوب، اخ، اخاذ، اجیز و، اجار وغیرہ بالترتیب باپ، طوفان، بھائی، لینا، پکڑنا، خراج، کرایہ پر لینا کے معنی میں آتے تھے اور موجودہ عربی زبان میں ان معنوں کی ادائیگی کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ موجود ہیں، جو بالترتیب نقل کیے جاتے ہیں، اب، ابو، ہوب، اخ، اخذ، جزیہ، اجر، ان لفظوں کے وہی معنی آج بھی ہیں جو عہد بابلی میں پائے

جاتے تھے، اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اہل بابل کی زبان سامی الاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اصل عربی ہے (۵) البتہ یہ آج سے چار ہزار سال پہلے کی عربی ہے اور یہ اس کی ظاہری شکل و صورت بدل گئی ہے، نئے نئے لفظوں نے پرانے لفظوں کی شکل اختیار کرلی ہے کیوں کہ مقامی گرد وپیش کے احوال، تجربات، اور شخصی میلانات کا اثر زبان پر پڑنا ضروری ہے، اس کی واضح دلیل اردو کی موجودہ شکل جو دکنی اردو یعنی قدیم اردو سے بہت حد تک متباین ہے موجود ہے، اس لیے یہ ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بابلی زبان کی اصل عربی تھی۔

یورپ کے ماہرین علم الانساب نے صورت، اخلاق اور زبان کے علاوہ اختلاف رنگ کی بنا پر قوموں کی تین قسمیں کی ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق جنس ابیض عام امم سامیہ و فرنگستان، جنس اسود یا احمر یعنی باشندگان افریقہ، جنس اصفر جاپان وچین و بقیہ امم تورانیہ آگے لکھتے ہیں طوفان نوح کے بعد دنیا کی تمام قومیں ۳؍ خاندانوں یعنی بنو یافث، بنو حام اور بنو سام میں منقسم ہو گئیں، پھر ان تمام نسبی، لسانی اور لونی تقسیم واختلاف پر عالمانہ وناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عرب وشام وعراق میں آباد لوگ ہر نوعیت وتقسیم کے لحاظ سے ایک جماعت میں داخل ہیں جن کو تورات کے بیان کے مطابق بنو سام کہہ سکتے ہیں، امم سامیہ کا اطلاق سامی زبان بولنے والوں پر ہوتا ہے بایں طور کنعان (فینشیا) بابل اول، کوش (حبش) وغیرہ کا تعلق امم سامیہ سے ہے۔(۶)

امم سامیہ کا شمار دنیا کی قدیم ترین قوموں میں ہوتا ہے، ان کا اصلی وطن سرزمین عرب ہے اور یہ خیال کہ وہ کردستان کے کوہستانوں یا افریقہ وغیرہ سے ہجرت کرکے عرب میں آباد ہوئیں ناقابل اعتنا ہو گیا ہے، راجرس نے اپنی تصنیف ''تاریخ بابل واشور'' میں لکھا ہے کہ سامی قوموں کا مسکن اول عرب ہے جہاں سے وہ وسیع اور زرخیز علاقوں کی تلاش میں بابل وجزیرہ میں آکر آباد ہوئیں۔(۷)

اسی طرح نولدیکی نے اپنے مضمون ''السنۂ سامیہ'' میں صاف طور پر تحریر کیا ہے کہ ہم کو اس نظریہ سے اتفاق کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ عرب امم سامیہ کا مسکن اول ہے جو ہر اعتبار سے قابل تسلیم ہے (۸)، انسائیکلوپیڈیا کے ایک دوسرے مضمون نگار نے بھی یہ خیال ظاہر

کیا ہے کہ قبائل سامیہ کا عرب سے نکل کر دوسرے ملک میں پھیل جانا ممکن ہے اور بابل کی جانب نقل مکانی میں ان قبائل کے سامنے کوئی قدرتی مانع بھی نہیں تھا (۹)، توریت کے بیان کے مطابق وہ (سامی قبائل) پورب سے آگئے تھے اور سنعار (بابل) کے ملک میں بس گئے اور تب خدا نے ان کو تمام روئے زمین میں پراگندہ کیا (۱۰)، انسائیکلوپیڈیا اور توریت کی روایت سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ امم سامیہ کا اصل وطن پورب یعنی عرب تھا اور وہاں سے انہوں نے ہجرت کرکے اپنا وطن بابل کو بنایا، ان سے قبل اس علاقہ میں کسی آبادی کا سراغ نہیں ملتا۔

قدیم ترین کلدانی اور اشوری سلطنتیں: طوفان نوح کے بعد وادی دجلہ وفرات کے وسیع میدانوں میں جن کو اب عراق کے نام سے جانا جاتا ہے اور قدیم زمانہ میں اسے کلدہ کہا جاتا تھا، سیاسی وتمدنی لحاظ سے بڑی بڑی قومیں وجود میں آئیں اور انہوں نے اوراق تاریخ پر گہرے نقوش ثبت کیے، ان کے باقیات اور کتبے ان کی شان وشوکت اور تمدنی حالت وکیفیت کی گواہی دیتے ہیں، تاریخ ملل قدیمہ کے مصنف نے ان کی بابت لکھا ہے کہ کلدہ کے قدیم لوگوں کی اکثریت سامی قوم سے تعلق رکھتی ہے، چار ہزار برس قبل مسیح سے کلدہ کے لوگ گیہوں کی کاشت، مٹی سے مجسمے بنانا، دھاتوں کو استعمال کرنا، لکھنا، نقش ونگار بنانا اور شہر بسانا اور عمارتیں بنانا جانتے تھے، ان کے اکثر شہر پکی اینٹوں کے ہوتے تھے (۱۱)، قدیم کلدانیوں کے علوم کے متعلق صاحب طبقات الامم نے لکھا ہے:

وكان من الكلدانيين علماء من اجل الناس فضلا و حكما متوسعون في فنون المعارف من المهن التعليمية والعلوم الرياضية والالهية وكانت لهم عناية بار صاد الكواكب و تحقق بعلم اسرار الفلك و معرفة مشهورة بطبائع النجوم وخواص المولدات وقواها (۱۲)

کلدانی علماء علم وفضل میں بلند مرتبہ پر فائز تھے اور مختلف علوم وفنون، ریاضی، الٰہیات وغیرہ میں دست گاہ کامل رکھتے تھے، رصدگاہ کی تعمیر و ترقی سے بھی ان کو خصوصی لگاؤ تھا، فلکیات کے رازہائے سربستہ سے محققانہ واقفیت اور ستاروں کے اثرات، ان کے مزاج، پیدائش اور ان کے خواص پر بھی ان کی تحقیقی نگاہ تھی۔

آگے اس نے اس عہد کے بعد کے بعض مشہور حکمائے کلدہ میں ہُرمس بابلی کا ذکر کیا
ہے جو سقراط کا ہم عصر تھا اور لکھا ہے کہ ہُرمس بابلی اور قدما کی تصنیفات نجوم و فلسفہ، دست بردِ زمانہ
کی نذر ہو گئیں، ہُرمس نے مختلف علوم و فنون پر خود تصنیفیں کی ہیں، اس کی اہم تصنیفات میں
کتاب الطول، کتاب العرض اور کتاب قصیب الذہب کا نام لینے کے بعد لکھا ہے کہ یہ کتابیں
ہُرمس بابلی کی فضیلت علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ (۱۳)

عراق کے شمال میں دریائے دجلہ کے دائیں جانب جو پھیلا ہوا اہم دار خطہ ہے قدیم
زمانے یعنی دو ہزار قبل مسیح کے اوائل میں اس کو "شوبارتو" کے نام سے جانا جاتا تھا، امم سامیہ نے
یہاں ایک شہر آشور کے نام سے بنایا تھا "آشور" اس قوم کا معبود تھا، اسی نسبت سے ان کو آشوری
کہا جاتا ہے (۱۴)، ماہرین آثار قدیمہ نے آشوری سلطنت کے تین ادوار قائم کیے ہیں۔

آشوریوں کا دور قدیم (۴۰۰۰ ق م - ۱۵۹۵)، دوسرا (۱۵۹۵ ق م - ۹۱۱ ق م) اور
تیسرا (۹۱۱ - ۶۱۲ ق م) اور ان تینوں ادوار میں سب سے اہم دور تیسرے دور کی اخیر تین صدیوں
کو قرار دیا ہے جس میں سولہ نامور حکمراں گزرے، ان کے واقعات اور فوجی اور عسکری حملوں کی
تاریخ مورخین نے محفوظ و مدون کی اور اسی دور میں آشوریوں کی عظیم سلطنت کی بنیاد پڑی اور ان
کا دائرہ اقتدار ایشیا کوچک، سواحل ایجہ، مصر، خلیج عربی اور عیلام وغیرہ تک وسیع ہوا، مشرق اور شمال
کے پہاڑی علاقوں مثلاً بلاد آرمینیا وغیرہ ان کے علاوہ ہیں، شہنشاہ آشور سرجون ثانی نے صہیونی
خطوں پر حملہ کیا تھا اور ان کے دار السلطنت سامراء کو ۷۲۲ ق م میں فتح کر لیا تھا (۱۵)، آشوریوں
کے عہد سلطنت پر جب نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چار پایہ تخت تھے اور جن کی
نشان دہی ٹیلوں پر ملے آثار و باقیات بھی کر رہے ہیں، ایک آشور جن کا سطور بالا میں ذکر ہو چکا
ہے، دوسرا "کالح" جو موصل کے جنوب مشرق سے تقریباً ۳۲ کلو میٹر بعد دریائے دجلہ کے جنوب
میں واقع ہے اور وہاں کے ٹیلے "نمرود" کے نام سے معروف ہیں، تیسرا "نینوئ" یہ موصل سے چند
کلو میٹر پر دریائے دجلہ کے بائیں جانب ہے، چوتھا "دور شروکین"، یہ موصل کے شمال مشرق میں
۸۱ کلو میٹر بعد خرسباد نامی گاؤں کے پاس ہے (۱۶)، آشور کے قدیم بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ
نے نینوا ایستار نامی دیوتا کے لیے ایک معبد بنایا تھا، دوسرے بادشاہ نے تیرہویں صدی ق م میں

اپنے لیے ایک شان دار محل تعمیر کرایا اور رفتہ رفتہ نینوا آشوری قوم کا پایہ تخت بن گیا اور بادشاہوں
نے اس کی زرخیزی کے سبب آشور کو چھوڑ کر نینوا کو پایہ تخت بنا لیا۔ (۱۷)

آشوری سلطنت فوجی طاقت و قوت کے بل پر قائم ہوئی، یہ لوگ حملوں کے دوران
گھوڑوں اور تانبہ سے بنے ہوئے آلات کا استعمال کرتے تھے (۱۸)، اسلحہ میں ان کے پاس خم دار
کمان ہوتی تھی جس سے چھوٹے چھوٹے تیر پھینکتے تھے، نیزہ اور چھوٹی تلوار ہوتی تھی، وہ گھوڑوں
پر بلا زین اور رکاب کے سوار ہوتے تھے، صرف ایک چادر یا کمبل گھوڑے کی پشت پر ڈال لیتے
تھے (۱۹)، آشور ناز یربال، سارگن (سرجون) سناخریب اور آشور بانی پال وغیرہ آشوری سلطنت
کے نامور فرماں رواں گزرے ہیں جن کے عہد کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی تاریخ کا مطالعہ ماہرین
آثار قدیمہ نے براہ راست ان کے آثار و باقیات کی روشنی میں کیا ہے۔

کلدہ اور آشور کے جو حالات یہودی اور یونانی تحریروں میں پائے جاتے تھے اور جن
سے ان کی تاریخ، طرز معاشرت وغیرہ سے لوگ مکمل طور پر ناواقف تھے، فرانس اور یورپ کے
ماہرین نے موصل کے آس پاس کے کھنڈرات کھود کر دفینوں اور کتبوں سے ان کی مکمل تاریخ دنیا
کے سامنے پیش کر دی اور لوگوں کو ان کے طرز معاشرت، تمدن وغیرہ کا علم مضبوط بنیادوں پر
حاصل ہو گیا کہ قدیم زمانہ سے عراق ایک متمدن اور تہذیب یافتہ ملک رہا ہے۔

سلطنت نینوا: آشوریوں کا پایہ تخت جب آشور میں تھا تو اس زمانہ میں دجلہ کے کنارے
ایک اور شہر نینوا کے نام سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا، آشوریوں نے اس شہر کو ترقی دی،
ساتویں قبل مسیح سناخریب نامی بادشاہ نے نینوا میں شہر پناہ بنائی اور اس کے گرد خندق کھدوائی،
قدیم محل جو دریا کے کنارے بنا ہوا تھا اور اس کی طغیانی سے اس کی دیواریں خستہ ہو گئی تھیں اور
اس کے اندر پانی گھس آتا تھا، اس خطرہ کے سد باب کے لیے اس نے دریائے دجلہ کے بہاؤ کا
رخ دوسری جانب موڑ دیا، عمارت کو از سر نو تعمیر کرایا، اس کی چھتوں میں صندل، آبنوس وغیرہ
کی شہتیریں استعمال کی گئی تھیں، دیواریں منقش تھیں، اس محل کے گرد کنگورہ دار چار دیواری تھی،
محل کے صحن کی وسعت ۲۰ ہزار مربع گز تھی، اس سے متصل ایک بڑی حویلی تھی جس میں سنگ
مرمر لگے ہوئے تھے، اس کے دروازوں پر گائے اور شیر کے بڑے بڑے مجسمے تھے، اس حویلی کو

خراج خانہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیوں کہ زرو جواہر اور تمام قیمتی سامان جو لڑائی کے بعد حاصل ہوتے تھے، اس میں ذخیرہ کیے جاتے تھے، اس ترقی پذیر شہر میں آب پاشی و آب رسانی کا معقول نظم تھا جس کے سبب نینوا کے مضافات میں گیہوں اور جَو کے کھیت اور انگور کے ہرے بھرے باغات بھی تھے (۲۰)، مختصر یہ کہ قدیم زمانہ میں سلطنت نینوا ایک خوش حال اور شاداب سلطنت تھی۔

آشور بانی پال نے اپنے عہد حکومت میں نینوا کی زیب و زینت کو مزید چار چاند لگائے، سناخریب کے تعمیر کردہ محل میں ایک کتب خانہ بھی بنوایا جس میں صفحوں کی جگہ اینٹوں کا استعمال ہوا تھا اور ہر اینٹ کے دونوں جانب نہایت باریک خط سے لکھا گیا تھا، نینوا کی کھدائی میں یہ تحریر شدہ اینٹیں برآمد ہوئیں، ان اینٹوں کو پڑھنے کے بعد ماہرین نے بتایا کہ اس میں آشوری زبان کے صرف و نحو اور ممتاز شہروں اور سرداروں کے نام درج ہیں، نیز ایسے رسالے بھی تھے جن میں علم سحر اور ریاضی سے متعلق معلومات تحریر تھیں۔(۲۱)

آشور بانی پال کے بعد جب اس کا لڑکا تخت نشین ہوا تو سارا کوس نے نینوا پر حملہ کیا اور آشوری شہر دور، سار یوکن، آشور اور نینوا کو نذر آتش کر دیا، فاتحین نے دجلہ کا بند نینوا کی طرف کھول دیا جس سے پورا شہر غرق آب ہو گیا اور صفحۂ ہستی سے اس شہر کا وجود مٹا دیا، دار السلطنت کی تباہی کے ساتھ ساتھ آشوری قوم بھی معدوم ہو گئی اور غاصبوں نے شہر کو آپس میں بانٹ لیا۔(۲۲)

سلطنت بابل کا عروج اور حضرت ابراہیمؑ کی بعثت: سطور بالا میں گزر چکا ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد سب سے پہلے بابل کو حضرت نوحؑ نے آباد کیا، ان کے بعد ان کی نسل کے قدیم آشوریوں نے بابل کو ترقی دی، جدید ماخذ کے مطابق یہ شہر بغداد سے ۸۰ کلومیٹر دوری پر فرات کے کنارے پر واقع تھا، ہزاروں برس پہلے اس شہر نے خوب ترقی کی اور اس عہد کا اختتام حمورابی (۲۳) کی سلطنت پر ہوا (۲۴)، اس سلطنت کا ایک جابر و ظالم بادشاہ نمرود تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کا خدا کے متعلق مکالمہ ہوا، سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ

کیا آپ کو معلوم نہیں اس شخص کے بارے میں جس نے (حضرت) ابراہیم سے اس کے

الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ

(بقرہ ۲:۲۵۸)

رب کے بارے میں حجت کی جس نے اس کو سلطنت بخشا تھا، مکالمہ میں ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو موت و حیات کا مالک ہے، اس نے کہا میں بھی مارتا جلاتا ہوں، ابراہیم نے کہا اللہ تعالیٰ آفتاب مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال سکتا ہے، ابراہیم کے اس سوال پر وہ حیران و ششدر رہ گیا اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اہل علم و صاحب نظر واقف ہیں کہ بیشتر مورخین و مفسرین نے آیت میں وارد لفظ ''حآج'' کا فاعل نمرود کو مانا ہے، جدید محققین کی تحقیقات کے مطابق نمرود کوش کا بیٹا تھا (۲۵) اور اسی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ مقام اُر میں پیدا ہوئے، طبری نے اس کے مکالمہ کو بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے اور اس کو دنیا کے چار عظیم شہنشاہوں میں شمار کیا ہے، لکھتے ہیں:

ان اول ملک ملک فی الارض شرقها و غربها نمرود بن کنعان بن کوش بن سام بن نوح و کانت الملوک الذین ملکوا الارض کلها اربعة نمرود و سلیمان بن داؤد و ذو القرنین و بخت نصر مومنان و کافران ۔(۲۶)

نمرود بن کنعان روئے زمین پر مشرق و مغرب کا پہلا بادشاہ ہے اور وہ چار بادشاہ جنہوں نے پورے کرہ ارض پر حکومت کی، نمرود، سلیمان بن داؤد، ذوالقرنین اور بخت نصر ہیں، ان میں دو صاحب ایمان اور دو کافر تھے۔

جدید مآخذ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے بالکل آخر میں ڈاکٹر رابرٹ نے جب قدیم بابل کی کھدائی کا کام شروع کیا تو اس کو بابل میں ٹنوں مٹی کا ملبہ ہٹانے کے بعد ۲۲۰۴ فٹ لمبی دیوار ملی، اس لمبی دیوار سے ۳۸ فٹ باہر کی جانب ۲۵ فٹ موٹی ایک اور دیوار تھی اور اس سے متصل خندق تھی، اس خندق کے پار ۱۲ فٹ چوڑی دیوار مزید تھی، خندق کو پاٹ کر چوڑا راستہ بنا دیا گیا تھا، اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ ہر ۱۶۵ فٹ پر ۲۷ فٹ اونچے

حفاظتی مینار تھے، جن کی مجموعی تعداد ۳۶۰ تھی (۲۷)، قدما نے بھی قصر بابل اور اس کے میناروں کا تذکرہ کیا ہے، صاحب طبقات الامم نے کتاب الاکلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قصر بابل کی بلندی پانچ ہزار گز (۲۸) اور اس کی چوڑائی پندرہ سو گز تھی (۲۹)، کان فیما ذکرہ اهل العلم خمسة آلاف ذراع وکان عرضه الف خمس ماة ذراع ۔

امام رازی لکھتے ہیں:

ان المراد منه نمرود بن كنعان بنى صرحاً عظيماً ببابل طوله خمسة آلاف ذراع ...... ورام منه الصعود الى السماء ليقاتل اهلها ۔(۳۰) اس سے مراد نمرود بن کنعان ہے، جس نے بابل میں عظیم محل تعمیر کرایا تھا جس کی لمبائی پانچ ہزار گز تھی، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ آسمان تک پہنچ جائے اور آسمانی باشندوں کو قتل کردے۔

ہجرت ابراہیمی: حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سارے عالم میں تبلیغ وحدانیت کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور آپ کو اس اہم خدمت اور ذمہ داری کے لیے چن لیا تھا (وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ، بقرہ ۲: ۱۳۰) قرآن مجید میں جو اوصاف بیان ہوئے ہیں اس سے بہ صراحت معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں آپ کو "رشد" عطا کردیا گیا تھا (انبیا: ۵۱) اللہ نے آپ کو قلب سلیم عطا کیا تھا (صفت: ۸۴)، زمین وآسمان کے بہت سے راز ہائے سربستہ ان کے سامنے وا کردیے تھے (انعام: ۷۵)، احیائے موتی کے راز کو سمجھنے کے لیے جب انہوں نے اپنے لب وا کیے تو اللہ نے ان کو مطمئن کیا (بقرہ: ۲۶۰)، چنانچہ حضرت ابراہیم نے اہل بابل اور اپنی قوم کے لوگوں کو بت پرستی، آفتاب پرستی، ستارہ پرستی وغیرہ سے باز رہنے کی تاکید کی اور عملی طور پر بتوں کی مجبوری و بے بسی سے اپنی قوم کو روشناس کرنا چاہا تو اہل بابل ان کے خلاف ہوگئے اور اس صدائے احتجاج کو ہمیشہ کے لیے بند کردینا چاہا اور قتل کے ارادے سے ان کو آگ میں جھونک دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا اور آگ گل گلزار بن گئی اور وہ صحیح وسالم آگ کی بھٹی سے باہر آگئے اور اپنے اہل خانہ سمیت ترک وطن یعنی ہجرت کرکے عراق سے شام چلے گئے، قرآن مجید نے متعدد مقامات پر ان کی موحدانہ سرگرمیوں اور آزمائشوں کا تذکرہ کیا ہے، مورخین اسلام کی قیاسی تحقیقات کے مطابق نہر کوثار یا بابل کے نواح میں ایک مقام ہے جہاں

نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو آتش دان میں ڈالا تھا۔ (۳۱)

تاریخ ملل قدیمہ کے مصنف نے توریت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے پچھتر برس کی عمر میں پروردگار کی آواز سنی جس میں حکم دیا گیا تھا کہ "تو اپنے ملک (عراق) کے باہر جس جگہ کی میں نشان دہی کرتا ہوں، جا، میں تیری اولاد کو بڑی قوم بناؤں گا اور تیرے نام کو بڑی عظمت دوں گا اور تمام روئے زمین کی قومیں تیرے ذریعہ سے نجات پائیں گی، حضرت ابراہیم نے اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ اور خاندان کے دوسرے افراد کو ساتھ لے کر سوریہ (شام) پہنچے، پھر مصر اور وہاں سے ایسے مقام پر پہنچے جہاں جانوروں کے لائق چارہ نہ تھا، اس لیے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے گلہ بان باہم دست وگریباں ہونے لگے تو حضرت ابراہیم نے حضرت لوط سے عرض کیا" میں یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے تمہارے درمیان فتنہ وفساد ہو کیوں کہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس لیے ہم دونوں یہیں سے الگ ہوجائیں، چنانچہ حضرت لوط نے دشت اردن کی راہ لی اور بحرالمیت کے کنارے قیام کیا اور حضرت ابراہیم بلوط کے درختوں کے نزدیک خیمہ زن ہوئے (۳۲)، اس کے بعد کی تفصیلات ہمارے اس دائرہ تحقیق سے خارج ہیں لیکن حموربی نام کا حکمراں محققین کی روایتوں کے مطابق حضرت ابراہیم کا ہم عصر تھا اور بڑے جلال وجبروت کا بادشاہ تھا" عراقی تمدن کے ارتقا میں اس کا نمایاں رول ہے، اس لیے سطور ذیل میں اس عہد کے متعلق معلومات دی جارہی ہیں۔

عہد حموربی کے تمدنی جلوے: مالک رام صاحب نے "حموربی اور بابلی تہذیب وتمدن" نام سے اس موضوع پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے، سید صاحب نے بھی تاریخ ارض القرآن میں مجملاً حموربی کے بارے میں مولانا سعید انصاری صاحب رفیق دارالمصنفین نے توریت اور شریعت حمورابی کے موضوع پر معارف اگست ۱۹۱۹ء میں گراں قدر معلومات فراہم کی ہیں، قارئین کی دلچسپی اور موضوع کے تقاضے کے سبب یہاں مالک رام صاحب کی کتاب سے عہد حموربی کے تمدنی کارناموں کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے، واضح رہے کہ مالک رام صاحب نے یہ معلومات تاریخ کے جدید سائنٹفک اصولوں کے تحت یعنی آثار قدیمہ کو پیش نظر رکھ بہم پہنچائی ہیں اور اسی نقطہ نظر سے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔

ان کی تحقیق کے مطابق دو ہزار قبل مسیح بابل (عراق) میں حموربی نام کا ایک بادشاہ

حکمراں تھا، یہ حضرت ابراہیم کا ہم عصر تھا، اس نے معاشرت سے متعلق قوانین وضع کیے اور انہیں پتھر کے ستون پر کندہ کرا کے سپارہ کے مندر کے احاطہ میں نصب کرادیا، سپارہ بغداد کے جنوب میں ۳۰-۴۰ میل کے فاصلہ پر ابوحبہ گاؤں کے ٹیلے پر واقع تھا، مالک رام صاحب نے اپنی کتاب کے پہلے باب میں قانون حمورابی کا مفصل جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ قانون حمورابی میں بددعا کرنے والوں، جادوگروں، جھوٹی گواہی دینے والوں، معبد یا حویلی کا سامان چوری کرنے والوں اور چوری کا مال خریدنے والوں، بھاگنے والے غلاموں، سیندھ لگانے والے ڈاکوؤں، بہانہ بنا کر راہ فرار اختیار کرنے والے ملازموں کی سزا قتل تھی، اسی طرح زراعت، پٹہ، قرض، آب پاشی، سینچائی، سود در سود، ڈنڈی مارنے، تجارتی قرض، امانت میں خیانت، ام الولد، ناجائز تہمت، نکاح، زنا بالجبر، داشتہ کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق وغیرہ سے متعلق قوانین حمورابی نے ترتیب دیے تھے اور اس کو اپنے دائرہ اقتدار میں جاری و نافذ کیا تھا، طلاق، جہیز، وراثت، لونڈی کے لڑکے کے حقوق، آزاد عورت کے حقوق، جہیز کے ورثا، مذہبی عورت (پجارن) کے حقوق، متبنیٰ کے حقوق، دایہ کے فرائض، ڈاکٹر کی فیس اور ذمہ داریوں سے متعلق قوانین کا احاطہ کیا ہے اور کل ۲۸۲ دفعات نقل کی ہیں۔ (۳۳) ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابل کا عظیم حکمراں حمورابی نہایت عاقل اور انصاف پسند حکمراں تھا اور اپنی مملکت میں عدل اور امن پر مبنی نظام کے قیام کا خواہاں تھا، مذکورہ دفعات کے بعد خاتمہ کی عبارت کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

صاحب عظمت وجلال بادشاہ حمورابی نے یہ قانون نافذ کیے ہیں تاکہ ان سے دنیا کو پوری پوری ہدایت ملے اور رحم وعدل پر مبنی حکومت قائم ہو، میں ہوں حمورابی، رعایا کا محافظ، میرا کام مشکلوں کو آسان بنانا اور ہر سو نور پھیلانا، میں نے پہاڑی اور میدانی تمام دشمنوں کا خاتمہ کردیا، برگزیدہ دیوتاؤں نے مجھے "نجات دہندہ" مقرر کیا ہے، ملک خوش حال اور باشندے امن کی دولت سے مالا مال ہیں، میرا عصائے شاہی انصاف کا نشان ہے، سومر اور اکد کے باشندے میرے جگر گوشہ ہیں، آگے لکھا ہے کہ اس کھمبے پر تحریر کردہ قوانین کا جو شخص پاس نہ رکھے گا یا ان میں تحریف کرے گا یا میری یادگاروں کو مٹانے کی کوشش کرے گا تو انو دیوتا جس نے میری حکومت قائم کی ہے، اس کو اس دنیا سے غارت کردے گا، پھر اس کی بددعاؤں کا لمبا تذکرہ ہے۔ (۳۴)

عہد حمورابی کے شہر بابل کے متعلق مالک رام صاحب نے ہیروڈوٹس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کی جائے پیدائش اُر (Ur) کے بالمقابل بابل زیادہ بڑا شہر تھا اور اس میں سو بڑے بڑے پیتل کے بنے دروازے اور ان پر پیتل ہی کے چوڑے چوڑے پترے تھے (۳۵) لیکن یہ بیان اس لیے معرض شک میں ہے کیوں کہ ان دونوں ہی شہروں کی کھدائی کے دوران اس قدر بڑے شہر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی دروازہ ہی کھدائی کے وقت دست یاب ہوا ہے، البتہ دارالسلطنت ہونے کے سبب عہد حمورابی میں اس شہر کی مرفہ الحالی اور اس کی آبادی میں اضافہ کا قیاس بلا شبہ درست ہوسکتا ہے اور یہ بات بھی یقین کی جاسکتی ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی اور وفور زر کے نتیجہ میں لوگوں نے بڑی بڑی حویلیاں اور بلند و بالا مکانات ضرور تعمیر کیے ہوں گے۔

مکانات عموماً دو دو تین تین کمرے سے لے کر چودہ کمروں پر مشتمل ایک اور دو منزلہ ہوتے تھے، مکانات کے ساتھ صحن ضرور ہوتا تھا اور بارش سے مکانات کی دیواروں کو بچانے کے لیے وسط کی جانب فرش نشیب میں ہوتا تھا، تاکہ پانی دیواروں میں نہ لگنے پائے، صحن عموماً پکی اینٹوں کے ہوتے، تاہم کمروں کا فرش کچا ہوتا اور اس پر مٹی لیپ دی جاتی تھی، متعدد گھروں میں مندر بھی ملے ہیں، مندر کے لیے کوئی الگ کمرہ نہیں ہوتا تھا بلکہ گھر کے کسی ایک کمرہ کے کونے میں ایک چبوترہ اور چبوترہ کی دیوار میں ایک چھوٹا سا طاق ہوتا تھا جس میں مورتیاں رکھی جاتی تھیں اور اسی چبوترہ کے نیچے ایک قبرنما گڈھا ہوتا جس میں اس گھر کے مردہ افراد کی نعش رکھ دی جاتی۔

حمورابی عہد سے پہلے عام اہل بابل شال (چادر) کے مانند کمر سے ٹخنے تک کا لباس زیب تن کرتے تھے اور امرا چوڑی اور لمبی چادر جو شانہ تک جسم کو ڈھک لیتی تھی پہنتے تھے لیکن حمورابی عہد میں شرفا باقاعدہ آستینوں والا کرتا استعمال کرتے تھے، خود حمورابی کی دریافت شدہ تصویر سے عیاں ہوتا ہے، عورتیں پوری چادر کے علاوہ ڈوپٹے کا بھی استعمال کرتی تھیں، اسی طرح زیب و زینت سے بھی غافل نہیں رہتی تھیں، کاجل اور متعدد قسم کے زیورات کا استعمال کرتی تھیں، انگوٹھی، چوڑی، کان کی بالی، آویزے، گلے کے ہار کے استعمال کا ثبوت تصویروں اور مقبروں کے باقیات سے ملتا ہے، ان زیورات کی تیاری میں سونے، چاندی، کانسہ، سیپ،

موتی، لاجورد اور بعض قیمتی پتھر بھی استعمال کرتے تھے، چاندی اور تانبا، سینا اور مدین سے منگائے تھے، بعض مرد گلے میں کنٹھے پہنتے تھے مگر عام مردوں میں اس کا چلن نہیں تھا، آئینے تانبے کے بنے ہوتے تھے۔

اس عہد کے کھانوں کے باب میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گیہوں، تل، کھجور اور گوشت سے زیادہ مچھلی ان کی مرغوب غذاؤں میں تھیں اور پتھر کی چکی سے آٹا پیسنے کا رواج تھا، دودھ کے لیے بھیڑ اور بکری اور مچھلیاں بھی پالتے تھے، آج ہی کی طرح ان کا گوشت بھی کھاتے تھے، شراب جو سے بناتے تھے، کھجور سے تاڑی تیار کی جاتی تھی اور یہ کام عموماً عورتیں انجام دیتی تھیں، جو کی شراب کو مزید ذائقہ دار بنانے کے لیے تل دار چینی اور بعض دوسری اشیا بھی استعمال کی جاتی تھیں، حکومت کی جانب سے ان کی قیمت متعین تھی، بائع ان سے منافع نہیں لے سکتا تھا۔

آثار قدیمہ کی روشنی میں محققین نے عہد حمورابی میں بہت سے پیشوں اور حرفتوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی اجرت حکومت کی طرف سے متعین تھی، زیادہ لینا جرم تھا، طبابت، سرجری، جہاز و کشتی سازی، جہاز رانی و ملاحی، بڑھئی گیری و لوہاری وغیرہ، سنار، کمہار، معمار، سنگ تراش، بت تراش، حجام، چمار، موچی، جلاہا، نداف، ٹھٹھیرا، دایہ بیطاری، عریضہ نویسی، ماہی گیری وغیرہ کے پیشہ سے اہل بابل وابستہ تھے۔(۳۶)

سطور بالا میں گزر چکا ہے کہ عہد حمورابی میں جادوگروں کے لیے سزائیں متعین تھیں اور اگر غلط جادو کسی پر کر دیا جاتا تو ثابت ہونے پر جادوگری کی سزا قتل تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد حمورابی میں جادوگری و سحر کا رواج تھا، اسی کے ساتھ ساتھ اہل بابل کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ بیماری جسم میں کسی روح بد یا جن کی موجودگی کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے اس کا علاج بھی منتروں اور ٹونوں ٹوٹکوں سے کرتے تھے، متعدد منتر بھی کھدائی کے دوران ملے ہیں جن میں کسی خاص بدروح کا نام لے کر اس سے کہا گیا ہے کہ تم اس مریض کے جسم سے نکل جاؤ(۳۷) لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ امراض کے ازالے کے لیے صرف ٹونے ٹوٹکے یا جادو منتر کا استعمال ہوتا تھا، دوائیں بھی استعمال کرتے تھے اور منتر بھی پڑھتے تھے، دوا اگر بودار ہوتی تو اس کا مقصد یہ ہوتا کہ بدروح اس سے

تنگ آ کر مریض کے جسم کو آزاد کر دے۔

''حضارۃ العرب و مراحل تطورھا'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ حمورابی کی اصل شہرت و عظمت صرف اس کی جنگی کارروائیوں کے سبب نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے مفتوحہ شہروں میں بابلی تہذیب و ثقافت کی نشر و اشاعت اور اس کے اعلا اخلاقی و معاشرتی قوانین کے نفاذ کے سبب ہے، مملکت کی نگرانی و تحفظ کی جانب اس نے خاص توجہ کی اور متعدد سڑکیں تعمیر کرائیں جس کے سبب شہروں میں خوش حالی و فارغ البالی آئی، اس نے فرات کے کنارے ایک لمبا پل تعمیر کرایا تھا جو شہر بابل کے دونوں اطراف کو جوڑتا تھا، ولم تقتصر شهرة حمورابی علی اعمالیه الحربیه بل امتدت الی الاصلاحات التی قام بها والی نشره الحضارة البابلیه وثقافتها فی البلاد التی فتحها۔(۳۸)

عہد بخت نصر اور یہودیوں کی عراق میں اسیرانہ آمد: بادشاہ نابوپلاسار (Nabupallasar)(۳۹) نے بابل کو ترقی دی، شہر پناہ بلند کرائی اور شہر کی شکستہ اور بوسیدہ عمارتوں اور شاہی محل کی تجدید کی، ابھی دوبارہ تعمیر و تجدید کا کام مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ ۶۵۴ ق م میں عمر طبعی کو پہنچ کر مر گیا(۴۰) اس کے بعد اس کا لڑکا بنوکدر اوسر جس کا ذکر بائبل میں بنوکدرصر کے نام سے آیا ہے، یہ نام بنوخدنصر پھر بوخت نصر پھر عربی تاریخوں میں بخت نصر ہو گیا ہے،(۴۱) تخت نشین ہوا، مولانا ابوالجلال صاحب کی تصریح کے مطابق قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل کی پانچویں آیت میں اسی بادشاہ کے بنی اسرائیل پر محاذ آرائی کرنے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے،(۴۲) بخت نصر کا تعلق کلدانی نسل سے تھا، بعض روایتوں کے مطابق حضرت سلیمان اور بعض کے مطابق بلقیس (ملکہ صبا) کی نسل سے تھا،(۴۳) صاحب کتاب التنبیه والاشراف نے لکھا ہے کہ بخت نصر کی حکومت کے ۱۳۵۷ سال بعد رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ہوئی(۴۴) یہ بہت جلال و جبروت کا بادشاہ تھا، اس نے یروشلم پر دو بار حملہ کیا، اور دوسرے حملہ میں وہ خود شریک تھا، اس نے یہودیوں کو قید کیا اور انہیں بابل لے آیا، محققین نے لکھا ہے کہ دونوں حملوں کو ملا کر ۵ ہزار یہودی قیدی تھے،(۴۵) وقد ضمن عدد الاسری الذین سیقو الی بابل لیلحقوا بالیهود من السبی الاول بحوالی ۵۰,۰۰۰ شخص، بخت نصر نے جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ شہر بابل کے استحکام اور اس کی زینت و آرائش

میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا، اور بابل کو عروس البلاد کے مرتبہ تک پہنچانے کی فکر میں ہمیشہ منہمک رہا اور بلاشبہ اس نے بابل کو اس مقام تک پہنچایا بھی، مشہور جغرافیہ نویس ہیروڈوٹس نے بخت نصر کے ۱۵۰ برس بعد جب اس شہر کی سیاحت کی تو لکھا کہ بابل بے نظیر ہے اور دنیا کا کوئی دوسرا شہر اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے، اس کے گرد دو فصیلیں ہیں، چاروں طرف گہری خندق چور اچکوں سے حفاظت کے سبب کھودی گئی ہے، یہ فرات کے دونوں طرف بنایا گیا ہے، جو حصار بنائی گئی ہے وہ ۶۵ میٹر اونچی اور دیوار کی موٹائی ۲۵ میٹر ہے، دیوار کے بالائی حصہ پر دو گاڑیاں بیک وقت چل سکتی ہیں، شہر پناہ میں ۲۵۰۲ برج ہیں، دو دو برج ملا کر بنائے گئے ہیں، وغیرہ تفصیلات سے قطع نظر اس شہر کی تعمیر اور اس ضمن میں اس کی محنت شاقہ اور اس شہر سے اس کی محبت کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے کتبہ کی تحریر ملاحظہ فرمائیں، لکھتا ہے:

"چوں کہ مارووک خداوند (دیوتا) نے مجھ کو بادشاہ کیا ہے، میں نے شہر کی تعمیر میں انتہائی محنت ومشقت کی ہے، اس شہر کو میں اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح عزیز رکھتا ہوں، میں نے ایک ایسا محل بنوایا جس کو دیکھ کر لوگ حیرت کرتے ہیں، یہی میرا مقام سلطنت ہے"۔ (۴۶)

معلق باغات: ماہرین آثار قدیمہ نے بابل کی اہم دریافتوں میں معلق (Hanging Garden) کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کے متعلق متعدد بیانات کتابوں میں منقول ہیں، ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی اس دریافت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ کھدائی کے دوران ایک عجیب سا کنواں ملا جس میں تین مالیں (چھت) تھیں اور ایک لمبی سی مال دو چوکور مالوں پر دھری تھی، اس کنویں میں ایک زنجیری نلکا رہا ہوگا اور اس زنجیر میں بالٹیاں ہوں گی، جو نیچے سے پانی لاتی ہوں گی، اور پھر اس کو عمارت کی چھت تک پہنچاتی ہوں گی، (۴۷) لیکن اس سے مشینی ٹکنک کا تصور سامنے آتا ہے، جو ظاہر ہے اس عہد میں مفقود تھا، اس کے برعکس معلق باغات کے متعلق فرانسیسی سینیوس کی تحقیق اس عہد کی تمدنی ترقی کے لحاظ سے زیادہ قرین صواب ہے، خلاصہ تحریر ملاحظہ ہو:

"محل کے نزدیک دریا کے کنارے دو مشہور معلق باغ تھے، جن کا شمار دنیا کے سات عجائب میں ہوتا ہے یہ معلق باغ درحقیقت مختلف بلندیوں کے

کوٹھے تھے، جن کی نہایت بڑی بڑی چھتیں اور ان کے متعدد مالے تھے، پہلا فرات کے کنارے تھا اور وہاں سے بلند ہوتا گیا تھا، ان چھتوں میں نادر و نایاب درختوں اور پھولوں کے درخت اور صدہا قسم کی گھاسیں لگائی گئی تھیں، ان کی نشوونما کے لئے ہر کوٹھے کے اندر نہایت زوردار بڑے بڑے (نل) پائپ یا پمپ لگائے گئے تھے، جو آب دریا کو پوری طاقت سے کھینچ کر اوپر چڑھاتے تھے"۔ (۴۸)

اس حیرت انگیز نظام آب پاشی سے یہ باغات سرسبز وشاداب رہتے تھے، بعد میں لوگوں نے بخت نصر کے اس حیرت زا کارنامے کو دیکھ کر اس کے متعلق طرح طرح کے افسانے اور دور از کار روایتیں گھڑ کر مشہور کردیں۔

بخت نصر نے متعدد مندر بنوائے، نہریں کھدوائیں، اس کے زمانے میں ہندوستان اور عرب سے براہ خلیج فارس مال بردار کشتیاں فارس سے فرات تک جاتی تھیں، اور عطر، کپڑے دوائیں، ہاتھی دانتوں، آبنوس اور قیمتی پتھروں کی تجارت اپنے عروج پر تھی اور بابل ایشیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا، (۴۹) اس کی مدت حکومت محققین نے ۴۳ برس لکھے ہیں، وقد دام حکمه ثلاثا و اربعين سنة (۵۰) (۶۰۵-۵۶۲ ق م) بخت نصر کے بعد اس کی سلطنت بابل کمزور لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو اس کے وقار کو باقی نہ رکھ سکے اور اس کی عظمت رفتہ کو ایرانی ہخامنشیوں نے مغلوب کرلیا۔

عراق میں ایرانی ہخامنشیوں کا داخلہ: ہخامنشی سلطنت کو ایرانی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ خانوادہ پہلے بابل اور نینوا کے حکمرانوں کا باج گذار تھا، اور انہیں خراج دیتا تھا، لیکن کورش دوم نے ایرانی اقوام کو متحد کیا اور ان میں قومیت کی روح پھونکی اور بالآخر اس قدر طاقت بنالی کہ میدی خانوادے کے آخری فرماں روا کو شکست دے دی اور دن بہ دن اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا، اور ۱۴ دنوں کے محاصرے کے بعد تخت سارد پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد ایشیائے کوچک کے یونانی مقبوضات پر کورش کا قبضہ ہوگیا، ۵۳۹ یا ۵۳۸ ق م کے بعد کورش نے بابل پر حملہ کرنے کے لئے دریائے فرات کے رخ کو دوسری طرف موڑ دیا، اور وہاں کے حاکم نینونید کے لڑکے بالتازار کو شکست دیتا ہوا بابل میں داخل ہوا، اشراف وتجار بابل اور حکومتی

اہل کاران اپنے حکمراں سے ناخوش تھے، اس لئے کورش کو بابل پر قبضہ کرنے میں قابل ذکر مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اور ۵۳۸ ق م میں بابل کو فتح کر کے وہاں کے امرا اور تاجروں کے لئے موزوں حفاظتی انتظامات کئے، ان کے عبادت خانوں کے تقدس کا پورا خیال رکھا، اور عام قتل وغارت گری کی اجازت نہ دی، اس لئے اہالیان بابل نے اس کا خیر مقدم کیا، اس نے خود کو فاتح سمجھنے کے بجائے گذشتہ بادشاہوں کے جانشین کی حیثیت سے پیش کیا اور نیبونید کے ساتھ حسن سلوک کر کے اس کو کرمان بھیج دیا، اس نے مغلوبوں پر اپنا مذہب بھی مسلط نہیں کیا، رواداری اور انصاف پسندی کے اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اور ۷۰ سالوں سے اسیرانہ زندگی بسر کرنے والے یہودیوں کو جن کو بخت نصر نے قید کیا تھا فلسطین جانے، ویران عبادت خانوں کی تعمیر وآباد کرنے کی اجازت بھی مرحمت کردی، (۵۱)۔

قوموں کی آزادی سے متعلق کورش کا منشور: یہاں قوموں اور ملتوں کی آبادی سے متعلق کورش کبیر کا فرمان نقل کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کا ترجمہ اقوام متحدہ نے ۱۹۷۱ء میں اقوام متحدہ کی تمام سرکاری زبانوں میں شایع کرایا تھا، اس منشور میں کورش نے خود کو دنیا کا عظیم الشان بادشاہ کہا ہے، اور طاقت وقدرت ہونے کے باوجود تمام اقوام وملل کے عقائد ومذہب کا احترام ضروری قرار دیا ہے، منشور کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں:

> "جب میں رات کے وقت بابل پہنچا تو عوام کی مسرت وشادمانی کے ساتھ محل میں داخل ہوا، خدائے مردوک کی مدد سے میں نے بابل فتح کیا، اور سومر واکد کی سرزمین میں دہشت پھیلانے کی اجازت نہ دی، بابل کے مقامات مقدسہ کا احترام اور ان کی ضرورتوں کے سامان فراہم کئے، اس کے باشندوں کی مشکلیں آسان کیں، مکانات تعمیر کرائے، اور ان کی بدحالیوں اور محرومیوں کا خاتمہ کیا (۵۲)۔

کورش کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیت، تحمل، بردباری اور انسان دوستی کے سبب بلند مقام حاصل کیا تھا، اقوام عالم نے اسے نجات دہندہ کے لقب اور ایرانی "پدر ملت قدیم ایران" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کے بعد اس کے لڑکے

کمبوجیہ نے زمام حکومت سنبھالی جو اپنے والد کے زمانہ میں بابل کا حکمراں اور نائب السلطنت تھا، اس کے بعد دارکوش اول کا شمار ھخامنشی سلطنت کے نمایاں اور قابل ذکر فرماں رواؤں میں ہوتا ہے، یہ بھی کورش کی طرح باصلاحیت اور نظم مملکت میں ماہر تھا، اس نے اپنے بعد اپنے لڑکے خشایارسا کو نامزد کیا تھا، اس کے بعد متعدد ھخامنشی بادشاہوں نے وقفہ وقفہ سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور تقریباً تمام بادشاہوں نے بابل وعراق کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا، ۳۳۶ء میں داریوش سوم جب تخت نشین ہوا تو یونان کی سلطنت مقدونی قوت وطاقت کی لذت سے آشنا ہورہی تھی، چوں کہ داریوش نیک طینت انسان تھا، اس نے ایرانی سلطنت میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی، لیکن اس کے لئے وقت درکار تھا، اور فوراً یہ ممکن نہ تھا، اور ادھر مقدونی حکومت نے یونان کے تمام ملکوں اور شہروں کو اپنی حکومت کا اتحادی بنالیا، اور ھخامنشی حکمرانوں سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردیں، فیلیپ پہلا مقدونی فرماں روا تھا جس نے یونانی ملکوں کے منتشر شیرازہ کو متحد کیا تھا لیکن ۳۳۶ ق م میں قتل کردیا گیا۔ (۵۳)

عراق میں سکندر کا داخلہ: جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوچکا ہے کہ بخت نصر کے بعد بابلیوں کی طاقت کمزور اور ختم ہوگئی اور ایرانیوں کا زور بڑھا اور انہوں نے اپنا دائرہ سلطنت عراق تک بڑھالیا، یہ حقیقت بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ اس کے بعد دنیا کے منظرنامے پر یونان وایران کی حکومت پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، اور دونوں قوتیں آپس میں معرکہ آرا ہوتی ہیں، سکندر سے پہلے عموماً اہل ایران طاقتور نظر آتے ہیں اور یونانیوں کو ایرانیوں کی غلامی کا داغ سہنا پڑتا ہے لیکن ۳۳۲ ق م میں سلطنت یونانی کا گل سرسبد اپنی عالمی فتوحات کا چپہ چپہ پر سکہ بٹھاتا ہوا دریائے فرات عبور کرتا ہے تو مورخین کے بیان کے مطابق اس کو دریائے دجلہ کے جنوبی جانب نینوہ (نینوا) کے قریب گوگامیلا پر شہنشاہ ایران دارا کی دس لاکھ پیادہ فوج، چالیس ہزار سوار، دو سو تلوار دھار رتھ، ۱۵ ہاتھی اور بہت سے یونانی اجیر سپاہی موجود تھے کا سامنا کرنا پڑا، سکندر نے پہلے اپنی فوجوں کو آرام کرنے کی اجازت دی اور کہا کہ جس نے اس جنگ کے لئے اس میدان کا انتخاب کیا وہی معرکہ آرائی کی تاریخ اور وقت کا تعین بھی کرے، چنانچہ وقت معینہ پر میدان کارزار گرم ہوا، اور سکندر کی حکمت عملی اور جنگی مہارت سے ایرانی شہنشاہ کو شکست فاش

ہوئی اور دارا کو میدان جنگ چھوڑنا پڑا، سکندر نے اس کا تعاقب کر کے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ثم تزاحف دارا و ھزمہ و قتلہ (۵۴) اس عرصہ میں سکندر کو بابلستان کو بھی زیر کرنا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ بابل پہنچ کر اسے اہل بابل سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، لیکن جب وہ اس مقام پر پہنچا تو اہل شہر نے فوراً ہتھیار ڈال دیے، اور شہر سے نکل کر اس کی اطاعت تسلیم کر لی، ان کی خیر مقدمی اور عدم مزاحمت کے سبب سکندر نے وہاں کے مقامی معابد اور مندروں کو از سر نو تعمیر کرایا، اور بیل دیوتا کے نام پر قربانی کی، پھر اس صوبہ کا کاروبار سلطنت تین عہدہ داروں، صوبہ دار، سپہ سالار اور افسر مالیہ، کے سپرد کر کے بابل سے سوس چلا گیا، (۵۵) سکندر کے بعد ممالک مفتوحہ اس کے مختلف سرداروں میں منقسم ہو گئے، بطلیموس نے مصر و شام پر قبضہ کیا، انٹی گونس نے ایشیائے کوچک لیا، سلوکیوس نے بابل و فارس اور ترکستان پر اپنی بساط حکومت بچھائی (۵۶) موخر الذکر نے شہر سلوکیہ کی بنیاد رکھی اور ۳۱۲ ق م میں اس نے بابل پر تصرف کیا اور اس خانوادے کی حکومت کا پایہ تخت پہلے بابل کو قرار دیا (۵۷) اس کے بعد مورخین نے شہر سلوکیہ کے متعلق یہ تحقیق بھی پیش کی ہے کہ سلوکیہ یونانی تہذیب کا بڑا مرکز اسی کے التفات خاص کے سبب بن گیا تھا اور موجودہ بغداد کے قریب دریائے دجلہ کے ساحل پر اس شہر کو بسایا گیا تھا (۵۸) اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ شہر بڑا تجارتی مرکز بن گیا اور قدیم تجارتی شہر بابل بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ گیا اس کے بعد اشکانی خانوادے نے اس پر فتح پائی جس کی تفصیلات اور سرزمین عراق میں اس خانوادے کے ظہور و حکومت کی تاریخ آئندہ سطور میں آئے گی۔ (باقی)

حوالے

(۱) معجم البلدان ذکر بابل، ج ۲، ص ۱۸۔ (۲) تاریخ ارض القرآن، ص ۸۸، طبع جدید و تمدن عرب، موسیو لیبان ص ۴۷۔ (۳) طبقات الامم، ص ۶، مطبعۃ السعادہ مصر۔ (۴) ایضاً، ص ۶۔ (۵) حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن ص ۲۱۹۔ (۶) تاریخ ارض القرآن، ص ۹۰۔ (۷) تاریخ بابل و اشور، ج ۱، ص ۳۱۵ بحوالہ تاریخ ارض القرآن۔ (۸) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، مکمل تفصیل گیارہواں ایڈیشن، ج ۲، ص ۶۲۰۔ (۹) ایضاً، ج ۲، ص ۲۶۳۔ (۱۰) تکوین باب گیارہ عدد ۱۰-۹۔ (۱۱) ص ۱۰۴۔ (۱۲) طبقات الامم، ص ۲۸۔ (۱۳) ایضاً، ص ۲۹۔

(۱۴) حضارۃ العرب و مراحل تطورہا عبر العصور ۱۵۳، وزارۃ الاعلام دائرۃ العلاقات العامہ، جمہوریہ عراق۔ (۱۵) حضارۃ العرب حوالہ مذکور۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۵۶۔ (۱۷) تاریخ ملل قدیمہ، ص ۱۲۰۔ (۱۸) حضارۃ العرب، ص ۱۵۶۔ (۱۹) تاریخ ملل قدیمہ، ص ۱۲۱-۱۲۲۔ (۲۰) ایضاً۔ (۲۱) ایضاً، ص ۱۳۱۔ (۲۲) ایضاً، ص ۱۳۲۔ (۲۳) علامہ سید سلیمان نے توریت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شنعار (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل یا امورافیل تھا اور پھر الف، ح اور ب پ اور ف کے مبادلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے السنہ سامیہ میں حروف کے بدلنے کا عام چلن ہے اور امورافیل بدل کر عبرتی تلفظ "حمورابی" ہو گیا اور حمورابی حضرت ابراہیم کا ہم عصر بادشاہ تھا جو بابل پران کے عہد میں حکمراں تھا (تاریخ ارض القرآن، ج ۱، ص ۱۳۱، طبع جدید)۔ (۲۴) المنجد فی الاعلام، ص ۱۰۶۔ (۲۵) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ۱۶: ۴۶۱، ۱۹۵۰ء۔ (۲۶) طبری، ج ۱، ص ۲۵۳، مطبوعہ بریل لیڈن، ۱۸۸۱-۱۸۷۹۔ (۲۷) بحوالہ انبیا کی سرزمین عراق ماضی حال مستقبل، ص ۱۹، فرید بک ڈپو، جون ۲۰۰۳ء۔ (۲۸) ایک گز ۳ فٹ کا ہوتا ہے۔ (۲۹) ص ۱۸۔ (۳۰) تفسیر کبیر تفسیر سورہ نحل، ج ۵، ص ۴۴۸، دار الطباعۃ العامرہ۔ (۳۱) بحوالہ جغرافیہ خلافت مشرقی، ص ۸۹۔ (۳۲) ص ۱۸۰۔ (۳۳) حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، مئی ۱۹۹۲ء، ص ۲۰ تا ۵۸۔ (۳۴) حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، ص ۵۹ تا ۶۳۔ (۳۵) ایضاً، ص ۱۶۲۔ (۳۶) یہ تمام تفصیلات حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ (۳۷) ایضاً، ص ۲۰۶-۲۰۷۔ (۳۸) ایضاً، ص ۱۴۳۔ (۳۹) مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم نے اس کا نام نبوپلاسر لکھا ہے، دیکھیے معارف جولائی ۱۹۵۰ء، جلد ۶۶، ص ۴۸۔ (۴۰) تاریخ ملل قدیمہ، ص ۱۴۳-۱۴۴۔ (۴۱) معارف جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۴۸۔ (۴۲) ایضاً۔ (۴۳) جیوش انسائیکلو پیڈیا، ۹: ۲۰۱ بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۴ ص ۱۲۹ (۴۴) ص ۲۳۰ (۴۵) حضارۃ العرب ص ۱۶۱ (۴۶) تاریخ ملل قدیمہ ص ۱۴۷ (۴۷) عراق ماضی حال مستقبل ص ۲۰ (۴۸) تاریخ ملل قدیمہ ص ۱۴۸ (۴۹) ایضاً ص ۱۵۰ (۵۰) حضارۃ العرب ص ۱۶۱ (۵۱) ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی و لسانی تاریخ ص ۷۱، ۷۲ (۵۲) ایضاً ص ۷۲ (۵۳) ایضاً ص ۹۵ (۵۴) تاریخ ابن خلدون ✽ الخبر من دولۃ یونان والاسکندر، ج ۲، ص ۱۸۸ (۵۵) تاریخ یونان ج ۳ باب ۲۴ ص ۴۶۴ تا ۴۶۶ (ترجمہ اردو) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ (۵۶) تاریخ ارض القرآن حصہ دوم ص ۵۳ (جدید ایڈیشن) (۵۷) ایران عہد قدیم کی سیاسی تاریخ ص ۱۲۱ (۵۸) ایضاً ص ۱۲۳۔

مکتوبات امام ربانیؒ

اعلا عربی زبان وادب کی مثال

جناب اورنگ زیب اعظمی*

مکتوبات امام ربانی شریعت وطریقت کا مرج البحرین ہیں، زبان فارسی ہے تاہم اس میں عربی کی عبارتوں کی بھی کثرت ہے، جابجا قرآنی آیات واحادیث نبویہ کے حوالے، عربی اشعار واقوال سے استشہاد اور عربی زبان میں بامعنی اور برمحل دعائیں فارسی مکتوب کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں، اوران سے صاحب مکتوب کی عربی زبان وادب پر کامل قدرت کا بین ثبوت ملتا ہے، ذیل میں اس کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قرآنی آیات: پہلے ہم قرآنی آیات کے نقل واستشہاد کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

"کم ترین بندگان احمد معروض می گرداند آہ ہزار آہ از بے نہایتی ایں راہ سیر باایں سرعت و واردات وعنایات باایں کثرت ازیں جا است کہ مشائخ عظام فرمودہ اند سیر الی اللہ پنجاہ ہزار سالہ راہ است تَعْرُجُ الْمَلٰئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ مگر ایمائے باایں معنی داشتہ اند چوں کار بیاس رسید وامید ہا منقطع گشت ہُوَالَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَہٗ درکار شد" (۱/۲۸)

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت خواجہ بزرگ نقش بند قدس اللہ تعالی سرہ الاقدس فرمودہ اند اہل اللہ بعد از فنا وبقا ہرچہ می بینند درخود می بینند وہرچہ می شناسند درخود می

*لکچرار (گیسٹ) سینٹر فار عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز اسکول آف لینگویجز جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔

شناسند وحیرت ایشاں در وجود خود از وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ پیش ازیں ہر سیرے کہ ہست داخل سیر آفاقی است کہ حاصلش بے حاصلی است" (۱/۷۸۔۷۹)

ایک جگہ قرآنی الفاظ سے کتنی بہترین تلمیح پیش کی ہے، لکھتے ہیں:

"پس سالکان سبل طریقت وحقیقت را گر در اثنائے راہ اموریکہ بظاہر باشریعت در جنگ اند ظاہر شوند وظاہر سازند مبنی بر سکر وقت وغلبۂ حال است اگر ازاں مقام گذرانید وبصحو آرند آں منافات بالکلیہ مرتفع می شود وآں علوم متضادہ بہ تمام ہباء منثور میگردند" (۳/۲)

اس طرح کے استدلالات واستخراجات کی بہ کثرت مثالیں ہیں لیکن ہمارا مقصود ان کا احاطہ نہیں۔

امام ربانی نے نہ صرف آیاتِ قرآنیہ سے استدلال کیا ہے اوران سے بہترین تلمیحات وکنایات لیے ہیں بلکہ ان آیاتِ کریمہ کی بہترین اور دلکش تشریح وتفسیر بھی کی ہے، صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے، اہل علم براہ راست ان گرامی مکاتیب کا مطالعہ کریں اور تشریحات وتوضیحات سے مستفید ہوں۔

"عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ" کی تفسیر یوں فرماتے ہیں:

"......در مطعومات وملبوسات لذیذہ وتفسیر حظِ نفس منظور نباید داشت بلکہ در اطعمہ واشربہ غیر از حصول قوت بر اداء طاعات نیتی دیگر نباید کرد وجامۂ نفیس بحکم کریمہ "خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ" ای عند کل صلاۃ بہ نیت تزئین مامور باید پوشیدہ ومشوب بہ نیت دیگر نباید ساخت......" (۲/۵۲)

"حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ" کی وضاحت کرتے ہیں:

"ہم چنانکہ مقصود از خلقتِ انسانی اداء عباداتِ مامورہ است مقصود از اداء عبادات تحصیل یقین است کہ حقیقت ایمانست تواند بود کہ آیت کریمہ "وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ" رمزی باایں معنی باشد چہ کلمہ حتی ہم چنانکہ از برائے معنی غایت می آید از برای معنی علیہ نیز می آمد ای لاجل اَنْ یَّاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ

مکتوبات امام ربانی

گویا ایمانی کہ پیش از اداء عبادات است صورت ایمان است نہ
حقیقتِ ایمان کہ تعبیر ازاں یقین کردہ شدہ......" (۹۰/۲)

ایک جگہ حضرت مجدد صاحب نے ایک اہم اصول تاویل کی طرف توجہ دلائی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تاویل وہی قبول ہوگی جو قرآن وسنت کے مشمولات ومفہومات کے خلاف نہ ہو، فرماتے ہیں:

"معنی تفسیری مشروط بنقل وسماع ست من فسر القرآن برأيه فقد
کفر شنیدہ وور تاویل مجرد احتمال کافی است بشرط آنکہ مخالفِ کتاب وسنت
نباشد......" (۳۱/۴)

یعنی ان کے نزدیک کسی رائے یا خیال کے لیے اصل کسوٹی کتاب وسنت ہیں اور بس۔

احادیثِ نبویہ: قرآن مجید کے بعد موقع بہ موقع آپ نے نبی ﷺ کے اقوال واحکام سے بھی استدلال کیا ہے، حدیث کی تشریعی حقیقت سے قطع نظر آپ ﷺ کے اقوال واحکام اعلیٰ عربی ادب کا بہترین نمونہ ہیں کیوں کہ آپ نہ صرف قبیلۂ قریش سے تھے جو کہ زبان دانی میں معروف تھا بلکہ بنوسعد میں تربیت پائی تھی جس کی عربیت میں مہارت ضرب المثل ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

اما گاہ است کہ ایں تائید وتقویت از اہلِ فجور وارباب فتور ہم می آید
چنانکہ سید انبیاء علیہ وعلیہم وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات از تائید آن مرد فاجر خبر دادہ
اند وفرمودہ ان اللہ لیوئید ھذا الدین بالرجل الفاجر......" (۹۲/۱)

نفس کی مخالفت کا درس اس انداز سے دیتے ہیں:

"در حدیث قدسی آمدہ است عاد نفسک فانها انتصبت
بمعاداتی یعنی دشمن دار نفس خود را زیرا کہ بدرستی آن نفس ایستادہ است بہ دشمنی
من پس تربیت نفس نمودن بہ تحصیل مرادات او از جاہ وریاست وترفع وتکبر فی
الحقیقت امداد کردن است بہ دشمن خدائے عزوجل......" (۲۴/۲)

فرقۂ ناجیہ کے وصف میں حدیث کی طرف یوں اشارہ کر کے فرماتے ہیں:

"اما لیلے کہ پیغمبر صادق علیہ من الصلوات افضلها ومن

معارف اگست ۲۰۰۸ء

التسلیمات اکملها بر تمیز فرقۂ واحدۂ ناجیہ از آں فرق متعددہ فرمودہ است آنست
الذین ھم علی ما انا علیہ واصحابی یعنی آں فرقہ واحدہ ناجیہ آنانند کہ ایشاناں
بر طریقے اند کہ من بر آں طریقم واصحاب من بر آں طریق اند......" (۷۱/۲)

دین میں نماز کی اہمیت ومنزلت اس طرح واضح کرتے ہیں:

"......فرائض ہمہ ہر چند قرب اصل می بخشند اما افضل واکمل آنها
صلوٰۃ است الصلوٰۃ معراج المومن شنیدہ باشی واقرب ما یکون العبد
من الرب فی الصلوٰۃ وقت خاص کہ حضرت پیغمبر را بودہ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ
والسلام کہ تعبیر ازاں بہ لی مع اللہ وقت فرمودہ نزد فقیر در نماز بود......نماز
است کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام راحت خود را دراں می جوید آنجا کہ میفرماید
ارحنی یا بلال......" (۸۸/۴-۸۹)

صورت معنی کا مفہوم اس انداز میں سمجھاتے ہیں:

"......اگر حقیقت التجا وتضرع میسر نشود صورت تضرع ونیازمندی را
زدست نمی باید داد وان لم تبکوا فتباکوا بیان ایں معنی است......"
(۳۸/۲)

امثال واقوال: اپنی بات کو مزید واضح اور مدلل بنانے کے لیے شیخ احمد سرہندی نے جس طرح آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور دوسرے وسائل وذرائع اختیار کیے ہیں، اسی طرح عربی امثال واقوال حکمت سے بھی برمحل اور بہ کثرت استدلال کیا ہے، ذیل میں اس طرح کی کچھ چیزیں درج کی جاتی ہیں:

لا یحمل عطایا الملک الا مطایاہ (۴۰/۱)القلیل یدل علی الکثیر
(۴۲/۱)الجرعة تنبئ عن البحر الغدیر (۴۲/۱)ان بعض الظن اثم (۷۸/۱)
ابن الفقیه نصف الفقیه (۷۸/۱)کل میسر لما خلق (۱۰۲/۱)کل حقیقة ردته
الشریعة فھو زندقة (۹/۲)الولد سر لأبیه (۱۵/۲)من کثر سواد قوم فھو منھم
(۲۰/۲)الظاھر عنوان الباطن (۲۰/۲)کل اناء یترشح بما فیه (۲۰/۲)

صاحب الغرض مجنون (۲۶/۲) مالا یدرک کله لا یترک کله (۲۷/۲) ان المعالجة بالأضداد (۴۹/۲) التکبر مع المتکبرین صدقة (۴۹/۲) من حام حول الحمی یوشک ان یقع فیه (۶۳/۲) انکسار العاصین أحب الی من صولة المطیعین (۶۴/۲) ان المیت کالغریق ینتظر دعوة تلحقه من اب او ام او اخ او صدیق (۸۱/۲) ما منا الاله مقام معلوم (۹۷/۲) الضرورة تقدره بقدرها (۱۰۳/۲) الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب (۱۰۶/۲) الباقی عند التلاقی (۱۲۴/۲) حسنات الابرار سیئات المقربین (۷/۳) حب الوطن من الایمان (۳۱/۳) العبرة للأصل لا للتبع (۶۳/۳) شر الناس شرار العلماء (۸۴/۳) خیر الناس خیار العلماء (۸۴/۳) الناس علی دین ملوکهم (۸۴/۳) السیف للضارب (۳/۴) لیس وراء العبادان قریة (۳/۴) من عرف الله کل لسانه (۹/۴) ریاء العارفین خیر من اخلاص المریدین (۱۶/۴) من دق باب الکریم انفتح (۲۴/۴) بدایة الاولیاء نهایة الانبیاء (۸۷/۴) الغریق یتعلق بکل حشیش (۹۷/۴) حب الشیء یعمی ویصم (۹۷/۴) الاثنان متغایران (۸/۵) ان المحدث اذا قورن بالقدیم لم یبق اثر (۷۰/۵) کلموا الناس علی قدر عقولهم (۹۷/۵) لا صلوة الا بحضور القلب (۱۵۱/۵)۔

مندرجہ بالا فقرے یا تو عربی ضرب الامثال ہیں یا آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ و کبار ادباء سے ماخوذ ہیں، ان کے مطالعہ سے شیخ احمد سرہندی کی وسعت معلومات کا پتہ چلتا ہے، آپ ان خطوط کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ شیخ احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بعض فقروں کے متعلق صراحتاً تحریر فرما دیا ہے کہ وہ ضرب الامثال ہیں جب کہ بعض فقروں کو برجستہ اپنے جملوں میں استعمال کیا ہے، جس سے صاحب مکتوب اور مخاطب دونوں کی قدر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

عربی اشعار: اپنی ہدایات و مواعظ حسنہ کو مزید مبرہن بنانے کے لیے آپ نے فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ عربی اشعار سے بھی استدلال کیا ہے، یہ اشعار انتہائی برمحل اور بامعنی ہیں، قاری کو انہیں ازبر کر لینا چاہیے، چند ملاحظہ ہوں:

۱- فلا طبیب لها ولا راقی (۱۶/۱)

۲-وبضدها تتبین الاشیاء (۱۸/۱)

۳- کیف الوصول الی سعاد و دونها   قلل الجبال و دونهن خیوف (۲۰/۱)

۴- قصة العشق لا انفصال لها (۲۰/۱)

۵- الیک یا منیتی حجی و معتمری   ان حج قوم الی ترب واحجار (۵۱/۱)

۶- اهلا لسعدی والرسول وحبّذا   وجه لرسول لحب وجه لمرسل (۵۶/۱)

۷- هنیئاً لأرباب النعیم نعیمها   وللعاشق المسکین ما یتجرع (۷۴/۱)

۸- ومن بعد هذا ما یدق صفاته   وما کتمه احظی لدیه واجمل (۹۰/۱)

۹- ما احسن الدین والدنیا لو اجتمعا (۹۴/۱)

۱۰- ما ان مدحت محمداً بمقالتی   لکن مدحت مقالتی بمحمد (۱۰/۲)

۱۱- العاقل تکفیه الاشارة (۲/۳)

۱۲- وقد کان ما خفت ان یکونا   انا الی الله راجعونا (۱۲/۳)

۱۳- وللأرض من کأس الکرام نصیب   (۱۵/۳)

۱۴- عش ما شئت فانک میت   والزم ما شئت فانک مفارقه (۱۷/۳)

۱۵- جنونی من حبیب ذی فنون   (۶۱/۳)

۱۶- صبت علی مصائب لو انها   صبت علی الایام صرن لیالیا (۸۵/۳)

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع (۴۴/۴)

۱۸- یراه المومنون بغیر کیف   وادراک و ضرب من مثال (۱۱۷/۴)

۱۹- کفرت بدین الله والکفر واجب   لدیّ و عند المسلمین قبیح (۱۴۰/۴)

۲۰- لانی فی الوصال عبید نفسی   وفی الهجران مولی للموالی

وشغلی بالحبیب بکل حال   احب الیّ من شغلی بحالی (۵/۵)

۲۱- یحرق بالنار من یمس بها   ومن هو النار کیف یحرق (۶۷/۵)

یہ صرف چند مثالیں ہیں جنہیں گرامی قدر مکاتیب سے سرسری طور پر درج کر دیا گیا ہے، اگر قاری ان مکاتیب کا غائر مطالعہ کرے تو اسے نظر آئے گا کہ انہوں نے کس طرح اور کیوں ان اشعار کا ذکر فرمایا ہے، پھر ان کے فارسی ترجمے یا مترادف فارسی اشعار صاحب مکتوب کی علمی منزلت اور ترجمے پر قدرت کا واضح پتا دیتے ہیں

عربی عبارتوں کا برمحل استعمال: عربی زبان وادب میں حضرت مجدد الف ثانی کی مہارت کی ایک مثال عربی جملوں اور عبارتوں کا برمحل استعمال ہے، یہ مکاتیب اگرچہ اکثر فارسی میں ہیں مگر تحریر کے درمیان وہ عربی جملوں اور عبارتوں کا اتنی خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے نگینے جڑے ہوئے ہوں، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

"عجب کاریست اولاً ہر بلا و مصیبت کہ واقع می شد باعث سرور و فرحت می شد و ھل من مزید می گفت و ہر چہ از اشعہ دنیویہ کم می شد خوش می آمد و ایں قسم آرزو می کرد"۔ (۱/۱۲)

"در وقت نزول از فوق ہمراہ خود چیزے کمتر آوردہ است مایۂ نسبتی کہ از توجہ قاصر بود و عروج از اثر آں توجہ بود ہنوز باقی است در نسبۂ جذبہ کالروح فی الجسد است و کالنور فی الظلمۃ لیکن ایں جذبہ حال غیر جذبہ خواجہا است......"۔ (۱/۳۳-۳۴)

"فوق مقام شہادت مقام صدیقیت است و تفاوتیکہ ایں دو مقام است اجل من ان یعبر عنہ بعبارۃ و اعظم من ان یشار الیہ باشارۃ و فوق آں مقامے نیست الا النبوۃ علی اصلہا الصلوات والتسلیمات......"۔ (۱/۳۰)

"پس مقصود از تحصیل آں ہر دو تکمیل شریعت است نہ امر دیگر ورائے شریعت احوال و مواجید و علوم و معارف کہ صوفیہ را در اثناء راہ دست می دہند نہ از مقاصد اند بل اوھام و خیالات تربی بہا اطفال الطریقۃ از جمیع اینہا گذشتہ بمقام رضا باید رسید کہ نہایت مقامات سلوک و جذبہ است......"۔ (۱/۳۸)

"...... بالجملہ بعد از تحملات بسیار و جواز از برائے اشتغال بایں علوم

پیدا می شود اما اگر مقصود از خواندن اینہا غیر از معرفت احکام شرعیہ و تقویت ادلہ کلامیہ امرے دیگر نباشد والا لا یجوز اصلاً انصاف باید کرد ارتکاب امر مباح کہ مستلزم فوت امور واجبہ باشد......"۔ (۲/۵۵)

"...... در بیان آں کہ جامعیت انسان باعث تفرقہ اوست و ہمیں جامعیت است کہ سبب جمعیت اوست کما نیل ما نیل للمحبوبین و بلاء للمحبوبین مکتوب شریف وصول یافت......"۔ (۳/۸)

"...... ارباب قلوب کہ در مقام تجلیات صفاتیہ از صفتے بہ صفتے و از اسمے باسمے منتقل و متحول اند تلون احوال نقد وقت ایشاں است و تشتت آمال حاصل مقام ایشاں دوام حال در حق ایشاں محالست و استمرار وقت در شان شان ممتنع زمانے در قبض اند و زمانے در بسط فھم ابناء الوقت مغلوبوہ فمرۃ یعرجون واخری یھبطون ......"۔ (۵/۴۰)

ان خطوط کا مطالعہ کریں تو ایسا لگے گا جیسے عربی جملوں اور عبارتوں کی آمد الہامی ہے، "ھل من مزید، کالروح فی الجسد، کالنور فی الظلمۃ" اور "والا لا یجوز اصلاً" وغیرہ اپنی جگہ پر فارسی میں متبادل نہیں رکھتے، ان سے جہاں صاحب مکتوب کی انشا پردازی کا پتہ چلتا ہے وہیں شیخ صاحب کی برجستہ تحریری صلاحیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

دعائیں: شیخ احمد سرہندی کی عربی زبان وادب پر مہارت کی سب سے بین مثال وہ عربی دعائیں ہیں جنہیں انہوں نے ہر مکتوب گرامی کے شروع میں حسب حال رکھا ہے، یہ دعائیں خود ان کے الفاظ میں ہیں، ان کی جامعیت اور معنویت دونوں آنکھوں کو خیرہ اور دلوں کو مسحور کر دیتی ہیں، ہمیں ان دعاؤں کو از بر کر لینا چاہیے، مقالہ کی تنگی کے پیش نظر صرف چند دعاؤں پر اکتفا کریں گے۔

۱- عصمنا اللہ سبحانہ وایاکم من التعصب ونجانا وایاکم عن التلھف والتأسف۔ (۱/۷۴)

۲- شرفکم اللہ سبحانہ بکمال الاتباع المحمدی وزینکم بالزی

السنی المصطفوی ......۔(۷۸/۱)

۳- نجانا اللّٰہ سبحانہ وایاکم عن زیغ البصر بحرمة سید البشر......۔(۶۲/۱)

۴- نصرکم اللّٰہ سبحانہ علی الاعداء ۔(۲۰/۲)

۵- عظم اللّٰہ سبحانہ اجرکم ورفع قدرکم و شرح صدرکم ویسر امرکم ۔(۲۴/۲)

۶- عصمکم اللّٰہ سبحانہ عما یعصمکم وصانکم عما شانکم بحرمة سید البشر المنفی عنہ زیغ البصر ۔(۶۳/۲)

۷- زادنا اللّٰہ سبحانہ وایاکم حمیة الاسلام ۔(۷۵/۲)

۸- رزقنا اللّٰہ سبحانہ وایاکم الاستقامة علی متابعة السنة السنیة علی صاحبہا الصلوة والسلام والتحیة ۔(۸۳/۳)

۹- أحسن اللّٰہ سبحانہ حالکم واصلح بالکم ۔(۱۰۲/۲)

۱۰- اللّٰہم لاتکلنا الی انفسنا طرفة عین فنھلک ولا اقل منھا فنضیع ۔(۳۰/۳)

۱۱- احسن اللّٰہ تعالیٰ احوالکم واصلح سبحانہ اعمالکم وآمالکم ۔(۸۵/۳)

۱۲- اللّٰہم وفقنا لمرضاتک وثبتنا علی طاعتک بحرمة سید الاولین والآخرین ۔(۱۰/۴)

۱۳- ثبتنا اللّٰہ سبحانہ علی تقلید العلوم الشرعیة علی مصدرھا الصلوة والسلام والتحیة یرحم اللّٰہ عبداً قال آمینا ۔(۸۷/۲)

مندرجہ بالا ادعیہ مبارکہ پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوگا کہ دعا کرنے والا خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کو شرط اولین قرار دیتا ہے اور ہر ایک دعا کو محمد ﷺ کے واسطہ سے بارگاہ ربانی میں پہنچانا چاہتا ہے، یہی اصل ایمان ہے۔

عربی تحریر کے نمونے: قارئین کے سامنے عربی زبان وادب پر شیخ احمد سرہندی کی مہارت وگرفت کے نمونے چند چھوٹے چھوٹے جملوں، پُرحکمت باتوں، برمحل اشعار اور برجستہ دعاؤں کی شکل میں پیش کیے گئے، ممکن ہے کسی کے ذہن میں طویل جملوں یا مکمل تحریر پر ان کی قدرت

میں شک یا سوال ہو، اسی شبہ کے ازالہ کے لیے ہم چند مثالیں ان کی طویل تحریروں کے بارے میں دینا چاہیں گے مگر چوں کہ صفحات بہت مختصر اور محدود ہیں، اس لیے صرف دو عربی خطوط پر اکتفا کریں گے اور قارئین کے لیے ان کے عربی خطوط کے دیگر حوالے درج کردیں گے، تاکہ جسے مزید تشنگی ہو وہ ان صفحات پر ایک نظر ڈال لے۔

حضرت محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین کی اطاعت واتباع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ارسل الی خواجہ جہاں فی التحریض علی متابعة سید المرسلین ومتابعة خلفاء الراشدین علیہ وعلیہم من الصلوات اکملہا ومن التسلیمات اتمہا سلم اللّٰہ تعالی قلبکم و شرح صدرکم و زکی نفسکم والان جلدکم کل ذلک بل جمیع کمالات الروح والسر والخفی والاخفی منوط بمتابعة سید المرسلین علیہ وعلی آلہ من الصلوات افضلہا ومن التسلیمات اکملہا فعلیکم بمتابعتہ ومتابعة خلفائہ الراشدین الھادین المھدیین من بعد وفاتھم نجوم الھدایة وشموس الولایة فمن شرف بمتابعتھم فقد فاز فوزا عظیما ومن جبل علی مخالفتھم فقد ضل ضلالا بعیدا ۔(۶۶/۱)

ولایت اور اولیاء کے مسئلہ پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"ھذا المکتوب ارسل الی المخلص الصدیق محمد الصدیق فی بیان مراتب الولایة عامة کانت او خاصة مع بعض خواص الخاصة إعلم ان الولایة عبارة عن الفناء والبقاء وھی اما عامة او خاصة ونعنی بالعامة مطلق الولایة وبالخاصة الولایة المحمدیة علی صاحبہا الصلوة والسلام والتحیة والفناء فیھا اتم والبقاء اکمل ومن شرف بھذہ النعمة العظمی فقد کان جلدہ للطاعة وانشرح صدرہ للاسلام واطمانت نفسہ فرضیت عن مولاھا ورضی مولاھا عنھا

وسلم قلبه لمقلبه وتخلص روحه كلية الى مكاشفة حضرت صفات اللاهوت وشاهد سره مع ملاحظة الشيون والاعتبارات وفى هذا المقام شرف بالتجليات الذاتية البرقية وتحير خفيه لكمال التنزه و التقدس والكبرياء واتصل اخفاه اتصالا بلا تكيف وضرب من المثال ـ

هنيا لأرباب النعيم نعيمها

ومما ينبغى ان يعلم ان الولاية الخاصة المحمدية على صاحبها الصلوة والسلام والتحية متميزة عن سائر مراتب الولاية فى طرفى العروج والنزول اما فى طرف العروج فلان فناء الاخفى وبقاء ه مختصان بتلك الولاية الخاصة وعروج سائر الولايات الى الخفى يعنى ان عروج بعض ارباب الولايات الى مقارم الروح و عروج البعض الى السر و عروج البعض الآخر الى الخفى وهو اقصى درجات الولاية العامة واما فى طرف النزول فلان لأجساد الاولياء المحمدية عليه وعلى آله الصلوة والسلام والتحية نصيبا من كمالات درجات تلك الولاية لما انه صلى الله عليه وسلم اسرى ليلة المعراج بالجسد الى ما شاء الله تعالى وعرض عليه الجنة والنار واوحى اليه ما اوحى و شرف ثمة بالروية البصرية وهذا القسم من المعراج مخصوص به عليه الصلوة والسلام والاولياء المتابعون به كمال المتابعة السالكون تحت قدمه لهم ايضاً نصيب من هذه المرتبة المخصوصة ـ

وللارض من كاس الكرام نصيب

غاية ما فى الباب ان وقوع الروية والدنيا مخصوص به عليه الصلوة والسلام والحالة التى حصلت لاوليائه الذين تحت قدمه ليست بروية والفرق بين الروية وتلك الحالة كالفرق بين الاصل

والفرع والشخص والظل وليس احدهما عين الآخر ـ (۳/۱۳-۱۶)

مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ فرمائیں جلد اول سے حصہ اول کے صفحات ۴۵ تا ۷۲، حصہ دوم کے صفحات ۱۰ تا ۱۲، ۳۳ تا ۳۶، ۹۱ تا ۹۶، حصہ سوم کے صفحات ۳۳ و ۳۴، ۹۷، حصہ چہارم کے صفحات ۴۷ تا ۴۹، حصہ پنجم کے صفحات ۷۵ تا ۷۹، ۱۲۰ تا ۱۲۳، ۱۳۳ تا ۱۳۶۔

نوٹ: یہ مضمون مکتوبات امام ربانی (بہ تصحیح و تحشیہ: حضرت نور احمد نقش بندی مجددی) مطبوعہ رؤف اکیڈمی، لاہور، پاکستان کی جلد اول کے مختلف حصوں پر مبنی ہے، یہ ایڈیشن ۱۳۳۱ھ میں نکلا ہے۔ (اعظمی)

اخبار علمیہ

وقت اور ضرورت کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی قرآنی انسائیکلو پیڈیا مہیا کرائی جائے جو اسلام اور قرآنی تعلیمات کے سمجھنے میں ممد ومعاون ہو، کیوں کہ براہ راست عربی زبان سے عدم واقفیت کی شرح بڑھ رہی ہے، حالاں کہ عربی زبان سے واقفیت کے بغیر کلام الٰہی کو سمجھ پانا دشوار ہے، اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مرکز برائے اسلام اور سائنس (کینڈا) کے سربراہ ڈاکٹر مظفر اقبال نے بین الاقوامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں اپنے لیکچر میں یہ تجویز پیش کی کہ عالمی سطح پر ایک ایسی قرآنی انسائیکلو پیڈیا تیار کی جانی چاہیے جس سے مستشرقین کے ذریعہ پھیلائے ہوئے شکوک وشبہات کی تردید کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات اپنے صحیح تناظر میں پیش کی گئی ہوں، انہوں نے اس کی تیاری کا مژدہ بھی سنایا اور کہا کہ مستشرقین کے اعتراضات کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ مسلم علما اور دانش ور قرآنی تعلیمات کو علمی انداز میں پیش کریں، یہ معاملہ صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ ان حق طلب غیر مسلم افراد کا بھی ہے جو قرآن کی تعلیمات سے آشنا ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا، دہلی کی ایک خبر میں APF نیوز ایجنسی کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ گلوبل وارمنگ کے سبب زمین پر زندگی کے متوازن نظام میں خلل واقع ہورہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس ارض خاکی پر بودوباش اختیار کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا اور موسمیاتی تبدیلی کے نتیجہ میں غذائی اشیاز مین سے ناپید ہوجائیں گی، سائنس دانوں نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے ہی ناروے کے جزیرہ Svalbard میں ایک پہاڑ پر عالمی بیج گودام بنایا ہے، یہ مقام قطب شمالی سے ایک ہزار کلومیٹر کی دوری پر ہے اور اس میں ایرکنڈیشنڈ کمرے ہیں جس میں دنیا بھر کے ڈھائی لاکھ قسم کے بیجوں کے نمونے رکھے گئے ہیں تاکہ موسمیاتی تبدیلی کے سبب جب اشیائے خوردنی زمین سے ختم ہوجائیں تو دوبارہ ان بیجوں سے زمین پر فصلیں اگائی جاسکیں، اس کا افتتاح ۲۶ فروری ۲۰۰۸ء کو کیا گیا جس میں دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں اور ماہرین ماحولیات نے شرکت کی۔

قلم میں گھڑی اور اس کے بعد روشنی کے لیے اس میں چھوٹے چھوٹے بلب لگائے گئے

جو بیٹری سے چلتے تھے، دونوں قسم کے قلم کافی مقبول ہوئے لیکن آج ٹکنالوجی کے اس عہد میں جب کہ برقی آلات کا سائز کم سے کم ہوتا جارہا ہے، سائنس دانوں نے ''ریڈیو قلم'' بھی تیار کیا ہے، اس قلم میں ایف ایم ریڈیو پروگرام دیا گیا ہے جس سے کتابت کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کے پروگرام بھی سنے جاسکتے ہیں۔

شیکسپیر کی تصانیف کا پہلا فولیو ایڈیشن ۱۶۲۳ء میں شائع ہوا تھا، اس کا ایک مجموعہ شمالی انگلینڈ کی ڈرہم یونی ورسٹی میں محفوظ تھا، دس برس قبل ۱۹۹۸ء میں اس مجموعہ کو جب یونی ورسٹی کی لائبریری میں نمائش کے لیے رکھا گیا تو وہ چوری ہوگیا، اس کی قیمت تیس ملین ڈالر بتائی جاتی ہے، دو ہفتے قبل واشنگٹن ڈی سی کے فولجر شیکسپیر کتب خانہ میں ایک شخص اس کی قیمت کے اندازہ کے لیے پہنچا تو لائبریری کے عملہ نے اس کی قیمت کے بہانہ اسے اپنے یہاں رکھ لیا، کیوں کہ اس نے حال ہی میں تصانیف اور آرٹ کی چوری سے متعلق ایک ویب سائٹ کو دیکھا تھا جس میں مسروقہ کتابوں میں اس مجموعہ کا نام سرفہرست تھا، انہوں نے ایف بی آئی کو اطلاع دی اور پھر برطانوی پولیس کو معلوم ہوا تو اس نے اس چور کو گرفتار کرلیا، چور کا بیان تھا کہ اس نے اس مجموعہ کو کیوبا سے حاصل کیا ہے، ڈرہم یونی ورسٹی کے ذمہ داران اب فولجر شیکسپیر لائبریری سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

''ڈیلی میل''، لندن کی خبر کے مطابق چین غذائی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے پچھلے دو سالوں سے نئے تجربات کررہا ہے، بچپان بی سیارچہ کے ذریعہ اس نے جب خلا میں نمو پانے کے لیے بیج روانہ کیے اور دو ہفتے بعد جب انہیں گوانڈرونگ زرعی اکیڈمی کے باٹ ہاؤس میں اُگایا گیا تو ٹماٹر ۱۰ کلو، مرچ ۱۹ انچ اور کدو کی جسامت ۱۵ گنا زیادہ ہوگئی، چین نے ایسے بڑی جسامت والے پھلوں اور سبزیوں کو جاپان، تھائی لینڈ اور سنگاپور کو فروخت کردیا ہے، رپورٹ کے مطابق یوروپی زرعی ادارے بھی اس کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں، زرعی محقق لوژی گیانگ کا یہ بیان بھی نقل کیا گیا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضرورت کی تکمیل کے لیے روایتی زرعی طریقے کے تجربہ میں ہمیں کامیابی مل رہی ہے، گویا خلا میں نمو پانے والے بیجوں کے میوے اور سبزیاں اپنے اصل حجم سے کافی بڑے ہوکر سامنے آرہے ہیں۔

۵۲ سالہ عدنان اختر جن کا قلمی نام ہارون یحییٰ ہے نے ۷۶۸ صفحات پر مشتمل

Atlas of Creation نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں ڈارون کے نظریہ ارتقا کا بہ دلائل رد کیا ہے، یہ کتاب شمالی امریکہ اور یورپ کے سائنس دانوں اور اساتذہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گئی ہے، اس میں تصویریں بھی ہیں جن سے اسلامی نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے کہ تمام مادی مظاہر اور ذی حیات مخلوقات ارتقائی عمل سے وجود میں نہیں آئی ہیں بلکہ تکوین کائنات ایک الہیاتی عمل ہے جس کا ڈارون کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، یونی ورسٹی آف ایڈنبرگ کے تاریخ فطرت کے سابق پروفیسر اوبرے میںگ نے اس کتاب پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس کو جھوٹ اور ہفوات کا پلندا قرار دیا ہے، اسکاٹ لینڈ میں یہ کتاب سال رواں کے اوائل میں پہنچی ہے، مصنف نے پروفیسر مذکور کی تنقید کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اہم عیسائی مصنفین کا اس کتاب کے خلاف شدید ردعمل کتاب کے موثر ہونے کی شہادت ہے، دنیا کی ساٹھ زبانوں میں اس کتاب کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس کی ۸۰ سے زیادہ ڈی وی ڈیز دست یاب ہیں، قیمت یوں تو ۹۹ امریکی ڈالر ہے لیکن خواہش مندوں کے لیے انہوں نے اس کو مفت ڈاؤن لوڈ کر لینے کی سہولت بھی فراہم کی ہے، اپنی اس کتاب میں انہوں نے مسیح موعودؑ اور مہدیؑ منتظر کے متعلق قرآن و حدیث کے اس نظریہ کو بہ دلائل پیش کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بہ حیثیت مسلمان اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور مہدی کے ساتھ مل کر دجال کا خاتمہ کریں گے اور دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور یہ سب مستقبل قریب میں ہوگا۔

ایک خبر کے مطابق سائنس دانوں نے ایک ایسا لیمپ بنایا ہے جس کی روشنی صرف کتاب ہی پر پڑتی ہے اور اندھیرے کمرے میں آس پاس خوابیدہ اشخاص کو تکلیف پہنچائے بغیر سکون سے کتاب پڑھی جا سکتی ہے، ایک دوسری حیرت انگیز خبر یہ بھی ہے کہ ماہرین نے ایک ایسا تالا تیار کیا ہے جو صرف اپنے مالک کے نشانِ انگشت (فنگر پرنٹس) کو پہچانتا ہے، یہ کمپیوٹر کے ساتھ منسلک ہے اور اس میں صرف ایک سو بیس افراد کے فنگر پرنٹس محفوظ کیے جا سکتے ہیں، کمپیوٹر میں محفوظ نشان انگشت کے علاوہ کوئی اور اس تالے کو کھول نہیں سکتا، اس میں فنگر پرنٹس ختم کرنے کی سہولت بھی ہے کہ جب چاہیں کسی کے فنگر پرنٹس مٹا کر اس کو تالا کھولنے اور بند کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔

ک۔ ص۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

مدینہ منزل، نیو سر سید نگر
علی گڑھ، یوپی
۲۰/۷/۲۰۰۸ء

محترم گرامی قدر مولانا عمیر الصدیق ندوی زید مجدہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا

معارف جولائی ۲۰۰۸ء میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی زید مجدہ کا مکتوب پڑھا، اس میں ایک مسئلہ جانشینی کا تھا وہ تو حل ہو چکا، دوسرا مسئلہ معارف کے ضیاء الدین اصلاحی نمبر نکالنے کا ہے، اس بارے میں عرض ہے کہ علامہ شبلی کی سوانح عمری حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" کے نام سے مرتب کی جو ۹۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، علامہ سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری "حیات سلیمان" مولانا شاہ معین الدین ندوی قدس سرہ نے مرتب کی جو ضخامت میں حیات شبلی سے کچھ کم ہے، حیات شبلی خطوط شبلی کی مدد سے مرتب کی گئی ہے، حیات سلیمان شذرات معارف کی مدد سے منصۂ وجود میں آئی، علامہ سید صباح الدین عبد الرحمان نے حیات شاہ معین الدین کی ترتیب شروع کی، چند قسطیں معارف میں شائع ہوئیں مگر وہ اب تک کتابی شکل میں نہ آسکی، میں نے مولانا ضیاء الدین اصلاحی قدس سرہ کی توجہ بار بار اس جانب دلائی، میری رائے ہے مولانا شاہ معین الدین ندوی، علامہ سید صباح الدین عبد الرحمان کی سوانح عمریاں مرتب کرنے کے بعد مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی مفصل سوانح عمری دار المصنفین سے شائع ہونی چاہیے، صرف ایک نمبر معارف کا کافی نہیں، پہلے سلیمان نمبر نکل چکا ہے، انہوں نے

نصف صدی اس عظیم ادارہ کی خدمت کی ہے اس لیے ان کی سوانح مرتب ہونی چاہیے، مولا
معارف کے شذرات ہی سے مل جائے گا، میں نے آپ کی خدمت میں ایک خط مولانا ضیاء الدین
اصلاحی قدس سرہ کے انتقال پر لکھا تھا مگر وہ سپرد ڈاک نہ کر سکا، بہر حال ان پر ایک مقالہ لکھ کر
ایجوکیشنل کانفرنس گزٹ کو دے دیا ہے، امید کہ آپ ہر طرح بخیر ہوں گے۔

والسلام

(پروفیسر) احتشام ندوی

مکتوب پٹنہ

عالمی رابطہ ادب اسلامی

بہار شاخ، پٹنہ

محب گرامی جناب مولانا عمیر الصدیق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا اصلاحی کی وفات کے بعد اب تک ان کا غم، کم نہیں، یہاں سے جانا تو سب کو
ہے، کوئی ہمیشہ رہنے کے لیے تھوڑے ہی آیا ہے لیکن بعض اشخاص کے جانے سے قوم وملت کو
عظیم خسارہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے جانے پر سب روتے ہیں اور مبتلائے غم ہوتے ہیں، مولانا
ضیاء الدین اصلاحی ہماری ملت کے گراں قدر سرمایہ تھے، اپنی علمی و دینی خدمات، اخلاق،
مروت، ایثار وقربانی، قناعت وتوکل، قومی و دینی اداروں سے غیر معمولی دل چسپی ومحبت کا
بہترین نمونہ تھے جس کی مثال آج کے مادی دور میں ملنا نہایت مشکل ہے، ان کے انتقال سے
ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے، خدا کرے ان کا کوئی بدل پیدا ہو، خاص طور پر دار المصنفین کے لیے
بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس کو اس قدیم ڈگر پر اس علمی و تحقیقی معیار پر کس طرح چلایا جائے،
تاہم آپ جیسے حوصلہ مند نوجوان عالم دین، مخلص وقناعت پسند، دانش ور اور محب گرامی ڈاکٹر
اشتیاق احمد ظلی صاحب جیسے دانا وبینا عالم وفاضل شخص کی موجودگی سے پوری امید بندھتی ہے کہ

اللہ نے چاہا تو یہ ادارہ اپنی قدیم روش پر چلتے ہوئے قائم ودائم رہے گا، یہ ادارہ تمام علمی و تحقیقی دنیا
کا ایک عظیم مرکز ہے، خدا اس کو نظر بد سے بچائے اور ترقی عطا فرمائے، آمین، ثم آمین۔
آپ نے حال کے معارف میں مولانا مرحوم کی یاد پر جو شذرات لکھے ہیں، وہ نہایت
اثر انگیز اور دل کو رلانے والے ہیں، اسلوب بیان نہایت خوب صورت اور انشا پردازانہ ہے، بلکہ
مجھے تو بے ساختہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وفیات یاد آگئیں۔
دار المصنفین سے میرا تعلق مولانا شاہ معین ندوی کے زمانے سے ہے، مولانا ضیاء الدین
مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، ملک کے مختلف علمی مذاکروں میں متعدد بار ان سے ملاقاتیں
ہوئیں، وہ ہر بار اخلاق ومحبت اور عجز وانکساری کے پیکر نظر آئے، خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ
عطا فرمائے اور ان کے رشتہ دار اور دار المصنفین کے رفقائے کار کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔
امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

والسلام

(ڈاکٹر) محمد عتیق الرحمان

مکتوب خالص پور

سوشل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن

خالص پور، اعظم گڈھ

۲۱؍جولائی ۲۰۰۸

برادر عزیز ومکرم مولانا عمیر الصدیق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جون کے شمارہ کے خط میں میں نے لکھا تھا: ”کاش کوئی صاحب قلم، اختصار کے ساتھ
ہی، مولانا اصلاحیؒ کی حیات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر، منضبط انداز میں روشنی ڈالتا“،
یہاں میری مراد ”حیات شبلی“ اور ”حیات سلیمان“ جیسی کوئی گراں قدر تصنیف تھی، دار المصنفین

سے نصف صدی کی وابستگی (یہ مولانا کے متعدد اوصاف میں سے صرف ایک وصف ہے) اور
دین وملت کے تئیں علامہ شبلیؒ کے افکار ونظریات کے فروغ کی سعی پیہم کے پس منظر میں
سلیمان ندویؒ کے بعد نظر مولانا ضیاء الدین پر ہی ٹھہرتی ہے، ان کی سیرت وکردار، فکر ونظر اور
شبلی اکیڈمی کی ترقی کے لیے ان کے کارہائے نمایاں کے معروضی جائزہ کی ضرورت، حال اور
مستقبل دونوں کی ہے۔

جولائی کے شمارہ میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کے خط کی یہ تجویز پیش نظر ہے کہ:
''ان (مولانا) کی یاد میں معارف کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے، یہ ان کے لیے بہترین خراج
عقیدت ہوگا''، تجویز برمحل، مناسب اور قابل عمل ہے اور تصنیف کے مقابلہ میں نسبتاً آسان بھی،
ویسے جہاں تک مجھے علم ہے، معارف کی اکیانوے سالہ زندگی میں یہ غالباً پہلا خاص نمبر ہوگا(۱)
لیکن یہ روایت شکنی اگر بدعت حسنہ قسم کی ہو تو مضائقہ نہیں، یعنی مجوزہ نمبر کم از کم ''نقوش'' کے
خاص نمبروں کے پایہ کا تو ہو اور معارف کی بے حد وقیع اور قابل احترام علمی وادبی روایات کا
امین ہی نہیں مستقبل کے امکانات کا پاس دار بھی ہو۔

اس نمبر کو مولانا کی سیرت وصفات پر لکھی جانے والی کتاب کا پیش خیمہ بھی مانا جاسکتا
ہے۔

''مطبوعات جدیدہ'' کے بعد ''وفیات'' اور اب ''شذرات''، قلم کا یہ سفر مبارک ہو،
انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے، اللّٰھم زد فزد۔

خاکسار
ابرار اعظمی

(۱) معارف کی تاریخ میں صرف مولانا سید سلیمان ندویؒ نمبر نکلا ہے اور ایک عام شمارہ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی مرحوم کے لیے خاص کیا گیا۔ (ع-ص)

باب التقریظ والانتقاد

رول آف مسلمس
ان دی فریڈم موومنٹ آف انڈیا

مبصر: ڈاکٹر جاوید علی خاں

مرتبہ پروفیسر عبدالعلی و پروفیسر ظفر الاسلام، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد
مع گرد پوش، صفحات ۲۳۶، قیمت درج نہیں، پتہ: شعبہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبہ علوم اسلامیہ کے زیر اہتمام مارچ ۲۰۰۵ء میں ایک
سمینار مذکورہ عنوان کے تحت منعقد ہوا تھا، اس کتاب میں اسی سمینار کے بارہ منتخب مقالات جمع
کیے گئے ہیں، سمینار کا افتتاحی خطبہ اس وقت کے وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے پیش کیا تھا،
مقالات زیادہ تر ایسے مباحث ومعلومات پر مشتمل ہیں جو یا تو کم معروف ہیں یا ان کو دانستہ نظر
انداز کیا گیا ہے، اس کے اسباب میں اردو اور فارسی مصادر سے بے اعتنائی کے علاوہ تحریک
آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو محدود اور کم وقعت بتانا بھی ہے۔

مقالہ نگار حضرت میں پروفیسر مجیب اشرف، پروفیسر محمود الحق، پروفیسر ظفر الاسلام،
ڈاکٹر گلفشاں خاں، ڈاکٹر علی احمد، ڈاکٹر محمد اسماعیل، پروفیسر عبدالعلی، پروفیسر عبدالقادر جعفری،
مسعود احمد، ڈاکٹر شکیل اے صمدانی، سید نصیر احمد اور کبیر احمد خاں کے نام ہیں۔

پروفیسر مجیب اشرف نے بعض برطانوی مورخین کے متعلق لکھا کہ انہوں نے انیسویں
صدی اور بیسویں صدی کی چند فوجی انقلابی تحریکوں کے متعلق جن میں ۱۸۵۷ء کی تحریک بھی شامل

رفیق اعزازی دار المصنفین وصدر شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڈھ۔

ہے، حقائق کو مسخ اور ان تحریکوں کی اہمیت کو کمتر قرار دینے کی کوشش کی ہے، موصوف نے بعض قوم پرست مورخین کے متعلق لکھا کہ انہوں نے تحریک آزادی میں عدم تشدد کو غیر واقعی اہمیت دینے کے علاوہ مسلمانوں کے بارے میں یہ مفروضہ عام کیا کہ انہوں نے تحریک آزادی میں پرجوش تعاون نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس میں سرد مہری سے خود کو اس سے الگ تھلگ رکھا، پروفیسر اشرف نے چند معروف انقلابیوں کی شاندار خدمات کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کے مقالے کی اہمیت ان غیر معروف انقلابیوں اور محب وطن مجاہدین کے ذکر کی وجہ سے ہے، جن کی خدمات اور جن کے نام کا عام طور سے کم ذکر کیا جاتا ہے، جیسے مولوی احمد اللہ شاہ اور شیر علی، مولوی احمد اللہ کو برطانیہ کے وفادار راجہ پوئی نے قتل کرایا اور شیر علی کو گورنر جنرل لارڈ مایو کے قتل کے الزام میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا، پروفیسر اشرف نے رنگون، منڈالے، بنکاک، سنگاپور اور دوسرے مقامات کے مسلمان مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو بھی یاد دلایا، انہوں نے علمائے دیوبند اور کیرالا کے موپلا مسلمانوں کی حمیت وغیرت کا بھی ذکر کیا، جنہوں نے کبھی برطانوی حکومت سے مصلحت یا مصالحت کا رویہ نہیں اختیار کیا، مقالے میں ہندوستانی ذہنوں پر بالشویک انقلاب کے اثرات کے علاوہ مختلف انقلابی تحریکوں جیسے حزب اللہ، جگانتر، انوشیلان سمیتی اور المومناتی سمیتی کی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

پروفیسر محمود الحق عرب میں جدید حنبلیت کی ابتدا اور ارتقا پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کے فکر و خیال کو شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، حاجی شریعت اللہ، دودو میاں وغیرہ نے متعارف کیا، جدید حنبلیت کا اثر مختلف انقلابی اور اصلاحی تحریکوں جیسے وہابی اور فرائضی تحریکات اور ٹیٹو میر اور موپلا بغاوت میں دیکھا جا سکتا ہے، یہ تمام تحریکیں مذہبی جذبوں کی حامل ہونے کے ساتھ استعمار دشمن اور ملک میں سماجی و معاشی برائیوں کے خاتمے کی خواہاں تھیں، جہاد کی دعوت اور شرعی عدالتوں کے قیام سے ملک کے مختلف حصوں میں برطانوی سامراج کے خلاف مزاحمت کے مرکز قائم کرنے میں بھی مدد کی، پروفیسر حق نے مسیحی یوروپیوں کے ساتھ اعلا ذات کے ہندوؤں اور ہندو زمین داروں کے اس اتحاد کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو مسلمان انقلابیوں کے خلاف قائم کیا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بے رحمی سے کچلا گیا اور

مسلمان زعما کی بڑی تعداد کو یا تو جلاوطن کیا گیا یا پھر سر دار پہنچا دیا گیا، پروفیسر ظفر الاسلام نے تحریک آزادی میں فتاوی کی اہمیت پر بحث کی ہے، یہ وہ پہلو ہے جو اب تک نظر انداز کیا گیا ہے، انہوں نے فتوی اور افتا کے اداروں کے اصطلاحی معانی کے بیان کے بعد بتایا کہ ان فتاوی کے مطالعہ سے ہندوستان میں قانونی و سیاسی صورت حال کو سمجھنے اور جنگ آزادی کو قانونی و شرعی حیثیت دینے کے اسباب کو جاننے میں مدد ملتی ہے، چند فتوے تو ایسے ہیں جن کی رو سے ہندو قیادت کے تحت بعض سیاسی جماعتوں بشمول کانگریس پارٹی کی تائید کی گئی، تحریک ترک موالات، سول نافرمانی، ستیہ گرہ اور خلافت تحریک کی تائید میں فتوے جاری کیے گئے، تاریخ تحریک آزادی میں ان فتووں کا سیاسی کردار نہایت انوکھا اور اہم ہے اسی لیے برطانوی حکومت کے اس عمل پر حیرت نہیں ہوتی کہ اس نے دو سو علما کی دستخطوں والے فتوی، نصرۃ الابرار کے نسخوں کو ضبط کر کے جلا دیا، اس فتوی کا قصور یہی تھا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد عمل کی تلقین کی تھی، محترمہ گلفشاں خانم نے برطانوی حکومت کی ان جابرانہ پالیسیوں کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ ہندوستانی معاشیات کو برباد کیا گیا اور جن سے مسلمانوں کی اور خاص طور پر علما اور اشرافیہ طبقے کی زندگی دہلی میں قابل رحم ہوگئی، انہوں نے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں جیسے دہلی مدرسہ، مدرسہ رحیمیہ اور مدرسہ رشید الدین خاں صاحب پر اس تباہی کے اثرات کی نشان دہی کرتے ہوئے ان اداروں کے علما کے فکر و عمل کے متعلق مفید معلومات مہیا کی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اداروں نے نوآبادیاتی حکومت کے خلاف کیسا رد عمل ظاہر کیا۔

ڈاکٹر علی احمد کے خیال میں علی گڑھ تحریک اور تحریک دیوبند، انقلاب ۱۸۵۷ کی ناکامی کا فطری نتیجہ ہیں، انہوں نے ان دونوں تحریکوں کے اغراض و مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ تحریک آزادی میں ان تحریکوں کے نمائندوں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عبیداللہ سندھی نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر محمد اسماعیل نے تفصیل سے بنگالی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو بیان کیا، انیسویں صدی میں بنگال مسلمانوں کی اقتصادی تباہ حالی اور مسیحی مشنریوں کے ذریعہ ان کے استحصال کا ذکر

کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان حالات نے فرائضی تحریک اور Baraset rising کو جنم دیا
اور حاجی شریعت اللہ، ٹیٹو میر اور دودو میاں نے مثالی ہمت اور قربانی کی داستان رقم کی، ان تحریکوں
نے جن کا مزاج بنیادی طور پر سماجی و مذہبی مقاصد تک محدود تھا بہر حال برطانوی اقتدار کو ختم
کرنے کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔

پروفیسر عبدالعلی اور پروفیسر عبدالقادر جعفری نے دو مشہور مجاہدین آزادی مولانا برکت
اللہ بھوپالی اور مولوی لیاقت علی الہ آبادی کی حیات و خدمات کو اپنا موضوع بنایا، ملک کی سالمیت
کے لیے ان دونوں مجاہدوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے تعاون حاصل کیا، اول الذکر نے
آخری سانس دیار غیر میں لی اور موخر الذکر نے جب ۱۸۵۷ کے انقلاب میں قلعہ الہ آباد پر قبضہ
کرنے کی ناکام کوشش کی تو ان کو گرفتار کر کے انڈمان نکوبار بھیج دیا گیا۔

جناب محمد جاوید انصاری نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کی شخصیت کو موضوع بحث بنایا،
ان کی جمعیۃ الانصار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ شیخ الہند نے سرحد پار سے آزادی کی تحریک کی
رہنمائی کی، وہ حجاز گئے اور عامل حجاز سے جہاد کا اعلانیہ حاصل کیا، ریشمی خطوط ان کی تحریک کا اہم
ذریعہ بنے، انہوں نے ترکی سے بھی مدد حاصل کرنا چاہی، شریف مکہ اور خلافت ترکی کے نزاع
میں یہ مدد مل نہ سکی اور شیخ الہند کو اسیر کر کے مالٹا بھیج دیا گیا، تین سال بعد رہائی ہوئی، دریں اثنا ان
کے شاگردوں نے جمعیۃ علمائے ہند کی تشکیل کی، کانگریس نے جب ترک موالات کی تحریک
شروع کی تو اس کی تائید میں شیخ الہند نے فتوی بھی جاری کیا۔

جناب مسعود احمد نے حسرت موہانی کی خدمات کا ذکر کیا اور ان کی سودیشی تحریک اور
اردوئے معلی اور رسالہ مستقل میں ان کے سوشلسٹ خیالات کی اشاعت پر بحث کی، مولانا حسرت
موہانی تین بار جیل گئے اور مجرم کی حیثیت سے ان کو پابہ زنجیر کیا گیا۔

ڈاکٹر شکیل اے صمدانی نے ٹیپو سلطان کی رواداری اور شہادت کا ذکر کیا، ان کے بعد
سید نصیر احمد صحافی کا مقالہ ہے، جس میں انہوں نے خصوصیت سے بنگال کے مسلم فقیروں کی تحریک
کا ذکر کیا، انہوں نے مسلمان صحافیوں مثلاً محمد باقر اور شعیب اللہ خاں اور بعض مسلمان خواتین
جیسے عمر بی بی، رضیہ خاتون اور نشاط النساء کی جرأت و بہادری کا بھی ذکر کیا، آخر میں کبیر احمد خاں

کا ایک منتخب اشاریہ بھی شامل اشاعت ہے، جس میں تحریک آزادی میں مسلمانوں کے کارناموں کا
احاطہ کیا گیا ہے، آزادی ہند کے سلسلے میں یہ وسیع مطالعہ و تجزیہ بروقت ہے کہ ہندوستانی صحافت
کا ایک بڑا حصہ اور ہندو انتہا پسند طاقتیں، ہندوستانی مسلمانوں کو ہند مخالف اور دہشت گرد ثابت
کرنے پر مصر ہیں، اس مجموعہ مقالات سے ان کو احساس ہونا چاہیے کہ مسلمان ملک کی تحریک آزادی
میں پیش پیش رہے، یہ مسلمان تھے جنہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ کی راہ ہموار کی اور جس پر بعد کے
ہندوستانی قوم پرست گامزن ہوئے، یہ وہابی اور فرائضی تحریک کے کارکن تھے جنہوں نے انڈین
نیشنل کانگریس کے سیاسی نعروں سے بہت پہلے عدم تعاون، سول نافرمانی اور انگریزی سامان کے
بائیکاٹ کی آواز بلند کی، مسلمان علما اور صحافیوں نے جرأت اور قربانی کی مثال قائم کی، کیا ہندو
اشرافیہ اس کی مثال پیش کر سکتا ہے، کیا ان کے ترکش میں فتوی جیسا کوئی تیر تھا اور یہ بھی ایک غیر
معمولی واقعہ ہے کہ اسلام کی آفاقی اخوت کے جذبے نے متعدد مسلم ملکوں کو ہندوستان کی آزادی
کے لیے تعاون پر آمادہ کیا، عرب ملکوں سے فتوے جاری ہوئے، ترکی اور افغانستان نے ہندوستانی
انقلابیوں کو اپنے ہاں پناہ دی حتی کہ جب مسلمانوں کو بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں اقلیتی درجہ
دے کر ثانوی حیثیت سے شمار کیا گیا، اس وقت بھی آزادی کی جدوجہد میں ان کا کردار نہایت
شاندار رہا اور حقیقت یہی ہے کہ ان کی شمولیت کے بغیر آزادی کی تحریک کو رفتار نہیں مل سکتی تھی،
واقعہ یہ ہے کہ دوسرے ابنائے وطن کی جدوجہد سے مسلمانوں کی کاوشیں کسی درجہ کم نہیں۔

بہر حال محض مطالعہ و تحریر ہی کافی نہیں، اس مجموعہ مقالات کو وزارت اطلاعات اور
دوسرے قومی اداروں کو خصوصاً ان اداروں اور شخصیات کو بھیجنا چاہیے جو ہندوستانی طلبہ کے
نصاب میں تاریخ کی کتابوں کی تدوین کرتے ہیں، مسلمانوں کو حکومت سے بہ اصرار کہنا چاہیے
کہ تاریخ کے باب میں مسلمانوں کی خدمات کو نظر انداز نہ کیا جائے، مسلمان مجاہدوں اور
شہیدوں کو ملکی پیمانے پر، ہر سطح پر یاد کیا جانا ضروری ہے، اس کے بغیر نہ تو ان کی عدیم المثال
قربانیوں کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہندوستان میں ایک متوازن معاشرہ کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

ادبیات

"ضیاء الدین اصلاحی"

عارضی زندگی سے دائمی زندگی میں

(مولانا قمرالدین) قمر اعظمی

موت بھائی کی ہے لوگو کسی پتھر کی نہیں
آج جائز ہے جو ہم چیخ کے فریاد کریں

وہ گیا ہے تو مری سبز خیالی بھی گئی
بول تو بول کہ اب کیا دل ناشاد کریں

قافلے یادوں کے آتے ہیں تو رکتے ہی نہیں
کون بتلائے کسے بھولیں کسے یاد کریں

"بھیا بابو"

صبح لکھتا ہوں شام پڑھتا ہوں
قسط در قسط جیتا مرتا ہوں

دیکھ کر کائنات رنگا رنگ
واہ کہتا ہوں آہ بھرتا ہوں

جب سے دیکھی ہے روشنی[1] کی موت
چاندنی رات سے بھی ڈرتا ہوں

لوگ کہتے ہیں اب نہ آئے گا
روز کیوں انتظار کرتا ہوں

کیا ضیا تھے یہ جانیں دانش ور
میں تو "بابو" کی بات کرتا ہوں

انگلیاں چار پنچ کی غائب
سجدۂ بے شمار کرتا ہوں

مشغلہ روز و شب کا مت پوچھو
آنسوؤں سے وضو میں کرتا ہوں

جو بھی آیا ہے اس کو جانا ہے
باری باری کا ورد کرتا ہوں

"بھیا" سوئے ہیں سن کے یہ آواز
کان اٹھاتا ہوں سر کو دھرتا ہوں

روز کہتا ہوں بھول جاؤں تجھے
بھول کر روز یاد کرتا ہوں

ٹوٹ کر گر پڑا فلک سے قمر
اب جو بکھرا تو بس بکھرتا ہوں

سمریا، نظام آباد، اعظم گڈھ۔

---

(۱) روشنی یعنی ضیا۔

مطبوعات جدیدہ

ہندوستان میں ذات پات اور مسلمان: از جناب مسعود عالم فلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۶۴۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی ۲۰۳۵، گلی قاسم جان اسٹریٹ، بلی ماران، دہلی ۶۔

اس ضخیم کتاب کا موضوع اگرچہ اسلام کی تاریخ کے روشن ابواب کے منافی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں، مسلمانوں کی آبادیاں، تعارف سے زیادہ تفاخر کا عملی اظہار ہیں، تکریم و عزت از روئے قرآن صرف اللہ، اس کے رسول اور ایمان والوں کے لیے ہے لیکن چند سماجی، سیاسی اور معاشی اسباب کی وجہ سے ایک حد درجہ ناگوار اور تکلیف دہ طبقاتی فرق و امتیاز بھی ان علاقوں میں راہ پا گیا، زیر نظر کتاب میں اسی حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے، اس کتاب کے چند اجزا جب رسالہ "زندگی نو" میں چھپے تو انہوں نے اہل نظر کی توجہ اپنی جانب مبذول کی، موافق اور مخالف دونوں قسم کی رائیں سامنے آئیں، اصل مسئلہ، کفاءت کا تھا کہ قرآن و سنت میں اس کی حقیقت کیا ہے اور فقہ کے ذریعہ زمانہ و ماحول کی رعایت اس میں کیسی اور کتنی ملحوظ رکھی گئی لیکن آہستہ آہستہ یہ بحث صرف اسی مسئلہ کفاءت تک محدود نہ رہی، اسباب و نتائج کی تلاش و توقع نے لائق مصنف کو مسئلہ کفاءت کے بعض ایسے ابعاد و جہات تک پہنچا دیا، جہاں سے تقسیم انسانیت کی موج بلاخیز، اسلام کی روح اور اس کے پیغام کو دریا برد کرتی نظر آنے لگی، یہ بحث کتاب کے دس کامل ابواب میں اس طرح پھیلی کہ ہندوستان میں اسلام سے قبل ذات پات کی تاریخ اور بڑی حد تک مستند تاریخ کے ساتھ اسلام کی آمد، مسلمانوں کے دور حکومت میں طبقاتی رویوں کا آغاز اور اس وقت کے علما کا کردار، اسی عہد میں برہمنی تحریکوں کا ظہور اور مغل حکومت میں ذات پات کی تفریق مزید وغیرہ کا مفصل مطالعہ مع تجزیے کے آگیا، آخر کے تین ابواب اس بحث کا سب سے طاقت ور حصہ ہیں اور یہ نصف کتاب سے زیادہ پر محیط ہیں، اس میں برہمنی تحریکوں کے نئے بھیس کی نشان دہی کے علاوہ معاصر علما و زعما یعنی علی گڑھ تحریک، دیوبندی و بریلوی، جماعت اسلامی اور اہل حدیث حتی کہ مسلم پرسنل لا بورڈ سے وابستہ علما کے خیالات کو بڑی تفصیل اور تکلیف سے اس احساس کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ہندوؤں میں باوجود اس کے کہ چھوت چھات اور ذات پات کو مذہبی درجہ حاصل ہے لیکن اسلام کے سایۂ مساوات میں جانے کے خوف سے بعض ہندو مذہبی پیشوا اور تحریکیں بہ درجہ مجبوری اس نظام کہن کے خلاف آوازیں بلند کر رہے ہیں

لیکن مسلمانوں میں ایسی ایک تحریک بھی نہیں، اس احساس میں کتنی واقعیت ہے، اس سے صرف نظر کی گنجائش اور سرسید کے بعض سخت جملوں کی مصلحت کے باوجود بعض علما کے یہ خیالات کہ ”عہد ماضی میں سلاطین اسلام رذیلوں کو ضرورت سے زیادہ علم نہیں حاصل کرنے دیتے تھے، اب دیکھو نائیوں اور منہاروں نے علم پڑھ کر کیا کیا فتنے پھیلا رکھے ہیں، بعض منہار تو سید بن بیٹھے“ یا بعض ایسے فتوے جن سے سید اور مزعومہ چھوٹی ذاتوں کے درمیان نکاح کے فسخ کرنے کا حکم ہے، حیرت انگیز ہیں اور مصنف کے الفاظ میں ان کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے، حیرت پر حیرت مولانا قاسم نانوتوی کے یہ الفاظ میں کہ ”اللہ نے چار بڑی قوموں کو دین کی خدمت کے لیے منتخب کیا ہے اور وہ سید، شیخ مغل اور پٹھان ہیں“ مفتی محمد شفیع کا یہ قول بھی نوجوان مصنف نے بڑی حسرت سے نقل کیا ہے کہ ”نسبی شرفاء کے سب گناہ، قیامت کے دن بلاشبہ نسبی شرافت کے سبب معاف کردیے جائیں گے“ واقعات وخیالات کا یہ مرقع بدنما ضرور ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ تصویر کے کچھ رنگ، پورے پس منظر کا احاطہ کرتے ہوں، آج کے حالات میں اس قسم کی بحث تو اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے، مصنف نوجوان ہیں اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بحالی کے خواہاں ہیں، اس لیے لہجے میں کہیں کہیں شدت بھی ہے، تاہم اشاعت اسلام کی ان کی تڑپ بھی خالص ہے، اس لیے اس نوائے تلخ کو گوارا کرنے کی ضرورت ہے اور ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی کے الفاظ میں اس چھیڑے گئے نغمے کو ہوش وحواس کی سلامتی کے ساتھ سننا چاہیے، امت کے مزاج وفکر میں یک گونہ تبدیلی اور گذشتہ عہد کی شدت میں کمی آئی ہے اور اس میں علما وصلحا وزعما کی مساعی کا اثر بہرحال ہے، گو فاضل مقدمہ نگار جناب فضل الرحمان فریدی کی نظر میں اصل سبب دور حاضر میں سفر، نقل مکانی اور تلاش روزگار کی بین الاقوامی تلاش ہے، لیکن یہ قول ان کے یہ پہلو اور بھی دردناک ہے کہ جو اصلاح اور جس انقلاب کو دینی اقدار سے مستنبط ہونا چاہیے تھا وہ مادی تغیرات سے پیدا ہو رہا ہے، غیر معمولی تحقیق اور ہر بات کے لیے حوالوں کا اہتمام قابل تعریف ہے لیکن کتاب کے نام کی عمومیت محل نظر ہے، شمالی ہند کے بعض علاقوں پر پورے ہندوستان کا انطباق غیر ضروری عموم ہے، محض شیخ کے شبہ میں علامہ شبلی، ان کی برادری یا دوسری اور برادریوں کو صراحت سے صدیقی لکھنا سنجیدگی میں ظرافت کی آمیزش پیدا کرنا ہے، نوجوان مصنف تحقیق، جستجو اور دیدہ ریزی کے علاوہ اسلام کی سربلندی اور انسانیت کی سرفرازی کے جذبوں کے لیے بھی مستحق تحسین وآفریں ہیں اور وہ بھی جنھوں نے اس نازک اور حساس مسئلہ پر ان کے جذبات وخیالات کو اظہار کی ہمت بخشی ہے۔

ع-ص